مجلس ادارت

جلد ۱۲۳ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۹ء عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اردو میں تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی انیس جلدیں عمدہ ٹائپ میں شائع ہوئی ہیں، اُن کی ترتیب میں پاکستان کے تمام مشہور اہلِ قلم نے تعاون کیا ہے، پنجاب یونیورسٹی لاہور کی اردو انسائیکلوپیڈیا کی پندرہ جلدوں کی تدوین ایک عظیم الشان علمی خدمت ہے اس کے بعد ان انیس جلدوں کی اشاعت ایک دوسرا قابل قدر علمی کارنامہ ہے،

اس برصغیر میں مسلمانوں نے اُردو، فارسی، عربی، بنگالی اور علاقائی زبانوں کے ذریعہ سے اپنے ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی خیالات کا اظہار جس طرح کیا ہے، اس کا احاطہ ان جلدوں میں کیا گیا ہے، اردو ادب پر پانچ، فارسی میں تین، عربی پر ایک، بنگالی پر دو، علاقائی ادبیات مغربی پاکستان پر دو، اور اشاریہ پر پانچ جلدیں ہیں، اسکی پہلی جلد بطور مقدمہ مسلم تہذیب، اسلامی فنِ تعمیر، خطاطی، اور مصوری پر اس لئے لکھی گئی ہے کہ یہ معلوم ہو کہ ان سے بھی ہمارا ادب متاثر ہوتا رہا ہے، یہ کام ۱۹۷۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۷۲ء میں ختم ہوا، اُن کی اشاعت سے اردو کی کم مائگی کے احساس میں بڑی حد تک کمی آجائیگی، جس کیلئے پنجاب یونیورسٹی لاہور مبارکباد کی مستحق ہے، ظاہر ہے کہ اتنے بڑے کام میں فروگذاشتوں کا ہونا ناگزیر ہے، اگر اہل نظر نے اُن کی طرف توجہ دلائی تو یہ بھی بڑی علمی خدمت ہوگی، خود مرتبین کو بھی اس میں تکدر پیدا نہ ہوگا،

دارالمصنفین میں یہ جلدیں بڑے شوق سے مطالعہ کی جارہی ہیں، انشاء اللہ ان پر آیندہ تفصیلی تبصرہ بھی ہوگا، ہمارے ایک رفیق نے اسکی دوسری جلد کی بعض اہم فروگذاشتوں کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے، مثلاً ابن صاعد اندلسی کی کتاب کا نام طبقات الامم کے بجائے طبقات الاسلام (ص۱) علامہ ابن حجر کی مشہور کتاب الدرر الکامنہ کو الدار الکامنہ (ص۵۱) مخدوم علی مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمان وتیسیر المنان بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن کو تبصیر الرحمان تیسیر المنان فی تفسیر القرآن (ص۱۶۹) فتاویٰ عالمگیری کے ایک مرتب قاضی عنایت اللہ مونگیری کو عنایت اللہ منگہوری (ص۲۵۹) لکھا گیا ہے، مشہور محدث شیخ ابن حجر مکی کا نام صرف ابن حجر چھپ گیا ہے، (ص۲۹۳) تعجب ہے کہ مولانا انور شاہ کشمیری کی خاتم النبیین کو ضرب الخاتم بتایا گیا ہے، (ص۲۰۹) مولانا ابو ظفر ندوی کو اسلام اور عربی تمدن، حکمائے اسلام اور تبع تابعین کا مصنف ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ اسلام اور عربی تمدن کرد علی کی تصنیف ہے، جس کے مترجم جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم ہیں، حکمائے اسلام کے مصنف مولانا عبد السلام ندوی مرحوم ہیں، تبع تابعین بھی مولانا ابو ظفر ندوی کی تصنیف نہیں۔

عربی ادب کی اشاریہ جلد میں خیر الدین زرکلی کی کتاب کا نام الاعلام کے بجائے الاعدم طبع ہو گیا ہے (ص۹۶) اسی طرح البدر الطالع کے مصنف کا نام قاضی شوکانی کے بجائے قاضی شعرلانی چھپا ہے، (ص۹۶) الشرح علی المنار کے مصنف ملا عبد السلام دیوی کے بجائے ملا عبد السلام ندوی درج ہے، (ص۷) ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون کو اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیف لکھا گیا ہے، حالانکہ اس کے مصنف اسماعیل پاشا البغدادی ہیں، (ص۸) حاشیہ علی عقائد النسفی کے مصنف کا نام علاء الدین ندوی درج ہو گیا ہے، علاء الدین لاری ہونا چاہئے، (ص۲۳) اس قسم کی اور بھی فروگذاشتیں ہیں جو ایسی اہم علمی تصانیف میں نہ ہونی چاہئیں، بعض جلدوں کے مباحث کی تعبیرات، تشریحات، تنقیدات اور تاویلات سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر اُن سے ان جلدوں کی اہمیت کم نہیں ہوتی، اُن کی افادیت اور اہمیت تسلیم کیجانی چاہیے، دارالمصنفین ڈاکٹر عبادت بریلوی پرنسپل، اورنٹیل کالج لاہور کا ممنون ہے کہ انھوں نے یہ ساری جلدیں دارالمصنفین کو نذر کیں، جس سے اُس کے کتب خانہ میں بڑا مفید اضافہ ہوا ہے، اور علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جارہی ہیں،

ترقی اردو بورڈ کراچی سے اُردو لغت کی جلد اول بھی دارالمصنفین کو ہدیۃً ملی ہے، یہ بڑی اور چوڑی تقطیع کے گیارہ سو پچانوے صفحے کی کتاب صرف الف مقصورہ پر مشتمل ہے، لغت نویسی کا کام بڑا مشکل اور صبر آزما ہے، خصوصاً جب اردو زبان کی ہو جو سنسکرت، پراکرت، عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ کا عطر مجموعہ ہو، اس لغت کی تیاری میں یہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک لفظ عہد بہ عہد کس طرح استعمال ہوا، اس کا کون املا صحیح اور کونسا کثیر الاستعمال ہے، اس کے مترادفات کہاں تک درست ہیں، پھر کونسے الفاظ اور محاورے عامیانہ اور کون سے سنجیدہ ہیں، کون سے اعلام ایسے ہیں جن کا جدا کرنا ممکن نہیں، پیشہ وروں کے الفاظ اور اصطلاحات ٹکسال سے باہر سمجھے جاتے ہیں یا نہیں، کسی مصدر یا لفظ کے ساتھ کونسا صلہ پیش ہوا، انہی اصولوں کو سامنے رکھکر یہ لغت محنت اور عرقریزی سے تیار کیا جا رہا ہے۔

یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ ہر لفظ اور اسکے معنی جو مختلف زمانے میں مروج رہے اُن کی سند کیلئے اقتباسات صحت، احتیاط اور تنقید کے ساتھ پیش کرنیکا اہتمام ہے، ساتھ ہی الا حقے مصطلحات، اعراب مکتوبی و ملفوظی، ادقاف، رموز اور علامات کی بھی تشریح احتیاط سے کی گئی ہے، نمونہ آکسفورڈ ڈکشنری کلاں کا رکھا گیا ہے جو ستر سال کے بعد تیار ہوئی تھی، بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی تحریک پر یہ کام شروع ہوا تھا مگر خدا کرے اسکی تکمیل میں ستر سال نہ لگیں، اسکی پہلی جلد اب شائع ہوئی ہے غالباً ۱۲ جلدوں میں ختم ہوگی، اسکی تدوین میں ایک بڑا لائق اسٹاف لگا ہوا ہے، اس کے بورڈ کے صدر جناب محمد ہادی حسین صاحب اور موجودہ مدیر اعلیٰ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ہیں جو کراچی یونیورسٹی کے بہت ہی ممتاز قابل اور متحرک استاد اور اردو کے مشہور مصنف بھی ہیں اس میں انکا دلچسپ پر مغز اور پراز معلومات مقدمہ ان کی علمی و ادبی بصیرت کا ثبوت ہے، امید ہے کہ ان کی سرگرمیوں اور کاوشوں سے اس لغت کی آیندہ جلدوں کی اشاعت میں زیادہ تاخیر نہ ہوگی،

اس لغت پر آیندہ تنقید یں بھی ہونگی اور تسامحات کی نشاندہی بھی کیجائیگی لیکن اسکی تمام جلدیں چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں آجائیں گی تو یہ کہنا پڑیگا کہ اس مفید کام کی وجہ سے اردو زبان کے وزن، وقار اور دولت میں ایسا اضافہ ہوا ہے جس پر اردو بولنے والے اسی طرح فخر کرسکیں گے جس طرح انگریزی بولنے والوں کو اپنی آکسفورڈ ڈکشنری کلاں پر ہے،

مخزن الغرائب مرتبہ شیخ احمد علی خاں ہاشمی سندیلوی تین ہزار ایک سو اڑتالیس فارسی شعرا کا بہت ہی ضخیم تذکرہ ہے جو ۱۲۱۸ھ میں مرتب ہوا، دارالمصنفین میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے، وہ بہت بڑی تقطیع کے ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، مشکل سے اٹھانے اٹھتا ہے، نیپی کی ایک یونیورسٹی کے ایک استاد نے اس کو ایڈٹ کرنے کی کوشش کی تو اس کے حجم کو دیکھکر گھبرا اٹھے، مگر اورینٹل کالج لاہور کے سابق پرنسپل اور اس برصغیر کے بہت ہی قابل قدر مصنف ڈاکٹر محمد باقر نے اسکو ایڈٹ کرنے کا صبر آزما کام اپنے ذمہ لیا ہے، اس وقت تک اُس کی دو جلدیں بہت عمدہ ٹائپ میں شائع کرچکے ہیں، جو حروف تہجی کے لحاظ سے ش تک کے شعرا تک پہنچی ہیں، ابھی معلوم نہیں کتنی جلدیں اور شائع ہوں گی اگر یہ پورا کام ڈاکٹر محمد باقر کی لائق ستایش محنت اور مشقت سے انجام پاگیا تو اُن کی بڑی اہم اور مفید علمی خدمت ہوگی جس کیلئے صرف پاکستان اور ہندوستان بلکہ ایران کا ادبی حلقہ بھی ان کا رہین منت ہوگا، انھوں نے از راہ علم نوازی دارالمصنفین کو دو جلدیں نذر کی ہیں جس کے لئے یہ ادارہ ان کا ممنون ہے،

مقالات

امتِ مسلمہ کی بعثت

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

عقیدۂ خلافت کے رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابتِ الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اُن میں سے اس کو مانتے اور اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے ہیں، اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی بھی تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے دو گونہ فرائض کے اصلی نمایندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں مگر اُن کی تبعیت میں اپنے اپنے وقت میں اُن کی اُمتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لئے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں، اور اب آپ کے بعد کوئی دوسرا قیامت تک آنے والا نہیں، تو امتِ محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں دنیا کی آخری اُمت ہو کر دنیا میں آئی، اسی لئے قرآن پاک اور احادیث نبویؐ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو آخرین یعنی پچھلوں کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے،

ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (واقعہ) — ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔

وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (جمعہ) اور اُن سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے،

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہو گی، کیونکہ کوئی نیا نبی قیامت تک آنے والا نہیں، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا، انھوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انھوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا کام بخشا، انھوں نے مغرب تک کام کو انجام دیا، اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ، بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے، (کنز-۶-۲۳۰)

اس حدیث میں دن سے مراد ظاہر ہے کہ زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی امت دنیا کی آخری امت ہے، صحیح بخاری[1] و مسلم و نسائی میں گویا اسی اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے،

نحن الآخرون السابقون، ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے،

یعنی ظہور کے لحاظ سے تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم بیہقی اور نسائی میں بھی ہے، (کنز-۶-۲۳۰) ابن ماجہ میں ہے، کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

نحن آخر الامم (کنز-۶-۲۳۰) ہم سب سے آخری امت ہیں،

غرض ان آیات و حدیث سے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا ہے کہ امتِ محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر

وہ آخری نبی کی امت ہے،

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے، اس لئے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی تبلیغ کرتا رہے گا، اور اہلِ عذر کی حجت کا قاطع ہوگا،

اس خصوصیتِ خاصہ کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے،

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا، اب ظاہر ہے کہ اس حفاظت کے جوارح مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرمائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو انجام دے گا، گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے، مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لئے بھی اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تھا، تو اس کا حصول بھی مجاہدات کے بعد ظہور ہوا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، وہ بھی اسباب و تدابیر کے پردہ میں پورا ہوگا، اور اس لئے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لئے اہلِ قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا، اور انہی کے ہاتھوں اور سینوں سے اس وعدہ کو پورا فرمائے گا، اور یہ وعدہ اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امتِ محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے، ارشاد الٰہی ہے،

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (انعام -) ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے، جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے، (اور

اہلِ تفسیر نے اس کو امتِ محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے، اور یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و استقبال دونوں کے لئے ہے یعنی قیامت تک امتِ محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا،[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے قرآن پاک کی پیشین گوئی ہے،

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ	اور تمھارے پیرووں کو تمھارے
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ	نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب
(اٰل عمران)	رکھوں گا،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہوں، اسی طرح اُن کے اصلی پیرو تو مسلمان ہی ہیں[2] مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں، گو گمراہ ہوں[3] بہرحال اس آیت سے یہ ظاہر ہے کہ اہلِ اسلام اور اُن کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں، اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں بھی مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبہ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ نزولِ مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا ہے،

قرآن پاک کے ان اشاراتِ نص کی تصریح احادیثِ نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے،

لَا تزال من امتی امة قائمة	میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت
بامر الله لا یضرهم من خذلهم	کو لے کر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے
ولا من خالفهم حتی یاتیهم	اور اُس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ
امر الله وهم علی ذالک،	سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی

---

[1] تفسیر خازن تفسیر آیت مذکورہ، [2] تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ،

[3] تفسیر روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ،

(بخاری علامات النبوة)	بات یعنی قیامت آجائیگی اور وہ اسی پر قائم
لا یزال ناس من امتی ظاهرین	میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب
حتی یاتیهم امر الله وهم	رہیں گے، یہاں تک کہ خدا کی بات
ظاهرون (بخاری علامات النبوة)	یعنی قیامت آجائے گی،
لا یزال من امتی قوم ظاهرین	میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ
علی النّاس حتی یاتیهم امر الله	غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت
(بخاری کتاب التوحید)	آجائے گی،
لَا یزال من امتی امة قائمة	میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ
بامر الله لا یضرهم من	احکامِ الٰہی کو لے کر قائم رہے گا، اس
کذبهم ولا من خذلهم	کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے
حتی یاتی امر الله وهم علی	اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے،
ذالك،	یہاں تک کہ قیامت آجائے گی،
(بخاری کتاب التوحید)	
لا تزال طائفة من امتی	میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ
ظاهرین علی الحق لا یضرهم	حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس
من خذلهم حتی یاتی امر الله	کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے
وهم کذالك،	اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہانتک
(مسلم کتاب الامارة)	کہ قیامت آجائے گی،
لن یبرح هذا الدّین	یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہیگا

قائماً یقاتل علیہ عصابۃ من	اس کے لئے مسلمانوں کی ایک جماعت
المسلمین حتی تقوم الساعۃ	ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ
(مسلم کتاب الامارۃ)	قیامت آجائے،
لا تزال طائفۃ من امتی	میری امت کا ایک گروہ قیامت
یقاتلون علی الحق ظاہرین الی	تک حق پر لڑتا رہے گا، اور اپنے
یوم القیامۃ (مسلم کتاب الامارۃ)	دشمنوں پر غالب رہے گا،
لا تزال طائفۃ من امتی	میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ
قائمۃ بامر اللہ لا یضرھم من	احکام الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے ان کو
خذلھم او خالفھم حتی یاتی	چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان
امر اللہ وھم ظاہرون علی	نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت
الناس، (مسلم کتاب الامارۃ)	آجائے گی، اور وہ غالب رہیں گے،
ولا تزال عصابۃ من	مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر
المسلمین یقاتلون علی الحق ظاہرین	ہمیشہ لڑتی رہے گی، اور قیامت تک
علی من ناواھم الی یوم	اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی،
القیامۃ، (مسلم کتاب الامارۃ)	
لا تزال عصابۃ من امتی	میری اُمت کی ایک جماعت
یقاتلون علی امر اللہ قاہرین	خدا کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی
لعدوھم لا یضرھم من	اور اپنے دشمنوں کو دباتی رہے گی،
خالفھم حتی تاتیھم الساعۃ	اس کے مخالف اس کو نقصان

وھو علی ذالک،	نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے
(مسلم کتاب الامارۃ)	اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے،

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی اور حدیثیں مذکور ہیں[51]، اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تسکین خاطر کے لئے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشنگوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گا، تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلام میں آیندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی، اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ادا ہوتا تھا، وہ مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی، بعض روایات میں ایک حدیث ہے، العلماء ورثۃ الانبیاء[52] یعنی امتِ محمدی کے علمائے حق انبیاء کے وارث ہوں گے، ظاہر ہے کہ یہ وراثت عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ سلسلہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ختم ہو چکا، بلکہ اُن کو نبوت کے فضائل و کمالات سے حسب استعداد و مراتب حصہ ملے گا، اور یہ تبلیغ دین، ہدایت خلق، دعوتِ حق، اقامتِ دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفع شبہات، ابطال باطلین، اور رد بدعات کے کام انجام دیں گے،

بلکہ علمائے امت کے علاوہ تمام صلحائے اُمت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[51] دیکھئے کنز العمال جلد سادس ص ۲۳۱ و ۲۳۵، [52] یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعدد مروی ہے، اور محدثین نے اسی لئے اس کو معتبر مانا ہے، دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی و کشف الخفاء عجلونی، ص ۴۴،

کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی، تو یہ امتیں بیک زبان امتِ محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی،

کادت ھذہ الامۃ ان تکون انبیاء کلھا، (مسند طیالسی صفحہ ۳۵۴ عن ابن عباسؓ ومسند احمد وابویعلی)

قریب ہے کہ اس اُمت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں،

ایک دوسری حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس اُمت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامۃ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیاے کرام صلوٰۃ اللہ علیہم کو حاصل ہوا، اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امتِ محمدیہ سے لیا جائے گا۔[1] یہ شاید اس لئے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے، حضرت عبادہؓ بن صامت سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے، "اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ۝

مجھے پکارو میں تمہیں جواب دوں گا یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کر دوں گا،

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاؑ کو حاصل تھا، اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا،

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ

اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں

[1] حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لتکونوا شہداء علی الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے،

اور یہ بھی صرف انبیاؑ کو کہا گیا تھا، اور تیسری یہ کہ اُن سے کہا گیا:-

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ

ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر شہادت دو،

یہ بھی پہلے صرف نبی سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو،

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں اُمتِ محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی،

"شہید" اور "شاہد" کے لغوی معنی "حاضر" کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہوسکتا ہے، مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لئے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لئے اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعوی کی تائید کے لئے اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لئے اسی لئے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان تمام معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے جن کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا،

۱- حامی اور مددگار کے معنی میں،

وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللہِ ۝ (بقرہ ۲-۳)

اور اللہ کے سوا اپنے حامیوں کو بلاؤ کہ قرآن کا جواب لائیں)

اس آیت میں اس معنی کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے،

وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۰)

اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں،

۲- ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں،

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ ہ — اللہ ہر چیز سے باخبر ہے،

(حج - ۲)

اس معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں،

۳- کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں،

وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَہِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ ہ (مائدہ - ۱۲) — (حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک میں اُن میں رہا، نگراں رہا،

۴- گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں،

فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا (نساء - ۲) — بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے،

۵- امورِ خیر کی تعلیم یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں،

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا (بقرہ - ۱۷) — اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو،

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے،

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ہ (آل عمران - ۱۲) — قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو،

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اُمتِ محمدیہ جو آخری اُمت ہے، اس لئے پردۂ عدم سے باہر لائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے، وہ ہر نبی کے دعویٰ کی شاہد، حمایتی، مددگار اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہوا، کیونکہ دینِ الٰہی کامل ہو چکا، پیغامِ الٰہی کی ہر حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے، اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض اُمتِ محمدیہ کے سپرد ہو گیا، اب یہ تنہا اُس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظامِ عدل کی برقراری، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے، رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا اور وہ ساری امتوں کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاءؑ کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے،

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ بلائے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی، وہ عرض کریں گے ہاں میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ اُن کی اُمت سے پوچھے گا، کہ کیا انھوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ میرے پاس تو کوئی ڈرسنانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا، تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے، وہ عرض

کریں گے، محمد اور اُن کی امت، تو یہ نوح کی شہادت دیں گے، یہ ارشاد فرماکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی، وَكَذَالِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا الخ (یعنی تم کو معتدل وعادل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو) (صحیح بخاری تفسیر سورۂ بقرہ)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں اسی معنی کی نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے، کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امتِ محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے، کہ دنیا میں یہی ایک اُمت ہے، جو تمام انبیاء علیہم السلام اور اُن کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس اُمت کے سلسلہ میں داخل ہی نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ اُن کے ایمان کا جزء ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں اُن کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا،

سورۂ حج میں سورہ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے،

هُوَاجتباكم وُمَا جَعَلَ عَلَيكُمْ	اسی اللہ نے تم کو (اے امتِ محمدیہ) تم
فی الدِّیْنِ مِنْ حرج ملةَ ابیکم	کو (ساری امتوں میں) چنا ہے، اور
ابْرَاهِیْمِ هو سماکم المُسْلِمِیْنَ	اللہ نے تمھارے دین میں کوئی تنگی
مِنْ قبلُ و فی هذا لیکونُ	نہیں رکھی، تمھارے باپ ابراہیم کا
الرَّسُوْلُ شهیدًا علیکم و	دین، اسی نے تمھارا نام مسلم پہلے
تکونوا شهدآء علی النّاس ہ	رکھا، اور اس قرآن میں بھی،

(حج آخر)	تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر،

اوپر کی تین آیتوں میں امتِ محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَسَطًا (عادل ومعتدل امت) خیر اُمَّةٍ (سب سے بہتر امت) هُوَاجتباکُمْ (تم کو خدا نے چنا ہے) یہ تینوں لفظ اس امت کی برگزیدگی، بہتری، اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ اخیر لفظ اجتباکم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا،) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے،

اس امتِ محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب قیامت تک کیلئے نبی ہوکر قیامت تک کی ساری امتوں کے لئے آخری نبی بناکر بھیجے گئے ہیں، اس لئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس فرض کو انجام دیا، اُن کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ اُمتِ محمدیہ کا فرض قرار پایا، اب جب تک دنیا آباد ہے ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشہ میں اس پیغامِ الٰہی کی دعوت و تبلیغ الیٰ یوم القیام امتِ محمدیہ کا فریضہ ہے، اسی کا نام بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امتِ محمدیہ کی بعثت ہے جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حسب ذیل فرمائی ہے،

تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہو کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے، اور اس کی قوم کو ایک ایسی اُمت بنایا جائے، جو دوسری قوموں کی

اصلاح کا ذریعہ بن جائے، تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے" (باب حقیقۃ النبوۃ)

شاہ صاحب کا منشاء یہ ہے کہ نبی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کر کے اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے، اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا وہ پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے، اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر تیسری قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہتا ہے،

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثت اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے،

هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (جمعہ: ۱)
وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی کے اندر سے بھیجا،

اور اُمت کی بعثت کا بیان ذیل کی آیت میں ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۲)
قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں مبعوث ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو،

اور حدیث صحیح میں اسی بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا،

فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ
تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے، اور اپنے رسول کی طرف

سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے، وہ پردۂ عدم سے اسی لئے باہر لائی گئی ہے، کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے، اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع میں آخری حکم :-

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ
میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے، جو یہاں موجود نہیں،

صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک کے لئے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لئے یہ جاری و ساری فرمایا گیا کہ ہر حاضر العلم دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے، ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے،

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (توبہ: ۱۵)
تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین (کا علم سیکھتے، اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے، تو اُن کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے،

داعیوں کی یہ بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی،

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے، جو پہلے بھی گذر چکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے :-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۝ (آل عمران : ۱۲)

ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ اس امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے، اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے، بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لئے سرفروشی کرے، اور اسی لئے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے،

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران - ۱۱)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے، جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے، اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے، اور یہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کے آغوش میں اپنا نیا خون لے کر آئیں، اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہتی تھیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے اُمّت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہو گئی، اور نومولود قوموں کا داخلہ بند ہو گیا، مگر ان اللہ یہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی، تو دوسری قوم آکر اس فرض کو ادا کرے گی،

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا

اگر تم نہ نکلو گے، تو خدا تم کو بڑی

وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۝ (توبہ : ۶)

تکلیف کا عذاب دے گا، اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا، (جو خدا کے پورے فرمانبردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے،

پھر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۝ (مائدہ : ۸)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا، تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا، جن کو وہ دوست رکھے، اور جسے وہ دوست رکھیں، اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں، اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں، اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے،

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہار حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی؛

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے، جہاں فرمایا ہے،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا	مومنو! رکوع کرتے اور سجدے کرتے
وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ	اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝	رہو، اور نیک کام کرو، تاکہ فلاح
وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ	پاؤ اور خدا کی (راہ) میں جہاد کرو،
هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ	جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے
عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ	تم کو برگزیدہ کیا ہے، اور تم پر دین
حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ	(کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی، (اور
هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ	تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا
مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ	دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی
الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ	پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان
وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى	رکھا تھا، اور اس کتاب میں بھی
النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	(وہی نام رکھا ہے)، تاکہ پیغمبر تمہارے
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا	بارے میں شاہد ہوں، اور تم لوگوں
بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ	کے مقابلہ میں شاہد ہو، اور نماز پڑھو
الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝	اور زکوٰۃ دو اور خدا کے (دین کی
(حج : ۱۰)	رسی) کو پکڑے رہو۔ وہی تمہارا
	دوست ہے، اور خوب دوست اور

ان آیتوں سے اس شاہد امت اور مجتبائے عالم کے حسب ذیل آثار و فرائض ظاہر ہیں،

۱۔ ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی،

۲۔ ادائے زکوٰۃ پر عامل،

۳۔ ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط

۴۔ رکوع و سجود و عبادت الٰہی کی خوگر،

۵۔ امور خیر پر حریص،

۶۔ راہ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی،

امت محمدیہ کا جو گروہ ان فرائض کو انجام دے گا، وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشینگوئیوں کا مصداق ہوگا، جو اس کی بقا اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور انہیں سے حق تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے،

سلسلۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اس مقدس سلسلہ کا پورا سٹ (یعنی سیرۃ النبی حصہ اول، سیرۃ النبی حصہ دوم، سیرۃ النبی حصہ سوم، (معجزات) سیرۃ النبی حصہ چہارم (منصب نبوت) سیرۃ النبی حصہ پنجم، (عبادات) اور سیرۃ النبی حصہ ششم (اخلاق) ہمارے دفتر میں ہر وقت موجود رہتا ہے، شائقین ہر وقت دفتر میں فرمائش بھیج کر، یا تشریف لاکر حاصل کر سکتے ہیں، ہر حصہ الگ الگ بھی مل سکتا ہے،

پورے سٹ کی قیمت : ۱۳۳ روپیہ،

"منیجر"

نئی دینی تعلیم

از۔ ڈاکٹر محمد معین فاروقی ریڈر شعبۂ زوولوجی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ایک زمانہ تھا جب شرق اسلامی ایک بحر زخار کے مانند تھا جس کی موجیں مشرق و مغرب کے ساحلوں سے ٹکراتی تھیں، لیکن آج وہ اس بند پانی کے مانند ہے، جو تلاطم سے ناآشنا ہے، سکون و جمود کی اس فضا میں ہر قسم کی آلودگی اثر انداز ہو رہی ہے، صدیوں سے اس حالت زار پر نوحہ خوانی ہو رہی ہے، جس نے حوصلوں کو پست اور دلوں کو مایوس کر دیا ہے، اس افسردگی اور پست ہمتی کی بنا پر ہم قعر ذلت میں گرتے چلے جا رہے ہیں، اب ضرورت ہے کہ امت مسلمہ کی ہمت افزائی کی جائے اور غور و فکر کے بعد ترقی و سربلندی کا ایک منصوبہ بنایا جائے، اور لوگوں کو تقریروں کے بجائے عملی قدم اٹھانے پر آمادہ کیا جائے۔

اسلامی ملکوں کا وہ طبقہ جو علم و فہم کے اعتبار سے ممتاز تھا، وہ مغربی افکار و خیالات اور مغربی تہذیب و تمدن پر اتنا فریفتہ ہو گیا کہ اپنے شعائر کی متاع بے بہا کھو بیٹھا اور لادینیت میں گرفتار ہو گیا، مغربی مفکرین کائنات اور انسان کو محض مادی نظر سے دیکھتے ہیں، اس فلسفے کے پیروان جاہلی عصبیتوں کو پھر سے زندہ کرنے پر راغب ہیں، جن کو اسلام نے ختم کیا تھا، وقت کا تقاضا ہے کہ

(۱) نئے طریقے سے اسلام کے لئے جد و جہد کیجائے، اور ایک ایسا ادب پیدا کیا جائے جو علمی ذہن کو مطمئن کر دے۔

(۲) اسلام پر پھر سے ایمان لائیں۔[1]

مسلم معاشرے کی اس صورت حال پر غور کرتے وقت علم دین میں اپنی بے بضاعتی سد راہ ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میدان مین قدم رکھنے کی جسارت اسلیے کیجا رہی ہے، تاکہ جدید علوم کے مسلمان طالب علم کا نقطۂ نظر اہل علم کی خدمت میں اصلاح کی خاطر پیش کیا جا سکے، موجودہ بدحالی کے وجوہ اگر ایک طرف مسلمانون کی تاریخ، سیاست، معاشرت اور معاشیات مین تلاش کی جائین تو دوسری طرف تعلیم قرآن اور حالات حاضرہ کا بھی جائزہ لیا جانا چاہئے، اس نظر سے اگر دیکھا جائے تو احکام خداوندی کی ایک قسم تو وہ ہے، جس کے لئے ایک مکمل قانون موجود ہے، اور دوسری وہ جس کیلئے کوئی باضابطہ شریعت تو موجود نہیں ہے، مگر تفکر فی خلق اللہ پر بڑا اصرار ہے، قرآن مجید میں طرح طرح سے اس پر زور دیا گیا ہے، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہماری عملی زندگی میں یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ تفکر کی اس قرآنی دعوت کی جانب باقاعدہ توجہ نہیں کی جاتی ہے، اس بے توجہی کے نتائج بہت دور رس ہیں، اسلیے اسلامی شخصیت سازی مین ایک قسم کا خلا محسوس ہوتا ہے،

کلام پاک پر جب غور کیا جائے، تو ایک عامی بھی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کس طرح اطراف و جوانب میں بکھری ہوئی مادی اشیاء پر قرآن حکیم ہماری توجہ دلانے کا خواہش مند ہے، کہیں اجرام فلکی کے مدارون کی طرف اشارہ کر کے نظام کائنات میں

---

[1] مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اس موضوع پر "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے۔

تدبر کی ترغیب دلائی جارہی ہے، کبھی پکتے ہوئے پھل اور پھوٹتے ہوئے بیجوں پر نئے نئے سوال چھیڑ کر فکر میں تحریک پیدا کی جارہی ہے، کہیں مویشیوں پر غور وفکر کی دعوت ہے کہ کس طرح ان کے خون اور فضلہ کے درمیان سے لذیذ دودھ نکل رہا ہے، کہیں پرندوں اور اونٹوں کی ساخت پر توجہ دلائی جارہی ہے، یہ دعوت فکر عام ہے، کسی مخصوص طبقے پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں کی گئی، بلکہ سبھی کو تفکر وتعقل پر آمادہ کیا گیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ فکری زاویے بھی بدلتے رہتے ہیں، ایک دور تھا، جب روحانیت کا زور تھا، اور الحاد کا زیادہ چرچا نہ تھا، آج روحانیت کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے، اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل اور یونیورسٹی گریجویٹس کے درمیان زبردست خلیج حائل ہوگئی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف اور انداز فکر سے ناآشنا ہیں، ایک معروضی طرز پر کائناتی مظاہر کو اپنا محور فکر بناتا، اور اس طرح عقل کو مطمئن کرتا ہے، دوسرا استدلال کے ان رموز سے ناآشنا ہے، کتنے ایسے ہونگے، جنھوں نے مدرسوں کی حدود سے نکل کر آسمان کے اس وسیع سائبان کے نیچے اللہ کی تخلیق کے وافر نمونوں پر اس نیت سے نظر ڈالی ہوگی کہ ان میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں، قرآن کی تاکید تھی کہ ناواقف اہل علم کی طرف رجوع ہوں، لیکن کتنے ایسے ہوں گے جنھوں نے اس ارشاد ربانی کو آویزۂ گوش بنایا، قدیم وجدید الگ الگ راہوں پر چل رہے ہیں، اگر یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تو آیات آفاق وانفس کی گرہ کشائی انسانیت کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتی، اور زمانۂ سابق کی طرح آج بھی مسلمان علم وتحقیق کے ہراول سمجھے جاتے اور پستی وپست روی کے بجائے امامتِ اقوام کے بلند منصب پر فائز ہوتے۔

آج واعظ قیامت کی منظرکشی کرتے ہیں، لیکن اگر اس کے ساتھ جاپان کی قیامت صغریٰ (ایٹم بم) کے واقعات بھی پیش کر دئے جائیں تو سامعین کو اندازہ ہوجائے کہ جب انسانی تخلیق میں یہ قدرت ہے تو اس کے خالق کی برپا قیامت کی حدت وہولناکی کا کیا حال ہوگا، آج حقائق کے مشاہدہ اور سائنٹفک اختراعات نے ایمان ویقین کے دروازے کس طرح کھول دیئے ہیں، ضرورت ان علوم سے کام لینے کی ہے۔ سائنسی انکشافات کے قابلِ قبول ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دعووں کے پس پشت وہ تاریخ ہے، جس کی بنیادیں تجربہ اور مشاہدہ پر استوار ہوئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کے آگے عقلِ انسانی سرتسلیم خم کرتی ہے۔

آج خرق عادات کے نمونے ظاہر نہیں ہوتے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ منقطع ہوچکا ہے، نفس پر عقل کی حکمرانی ہے، یہ سچ ہے کہ عقل ہی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، مگر عقل، بے راہ روی، گمراہی کے اسباب فراہم کرتی ہے، ضرورت ہے کہ عقل کی کج روی کا سد باب کیا جائے، ہم حالیہ حیاتیاتی اور طبیعیاتی انکشافات سے فائدہ اٹھائیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ان سے خالص علمی حد تک ہی اخذ واستفادہ کیا جائے، اور ان کی نظریاتی ومفروضاتی توجیہات پر بے چون وچرا اعتماد نہ کیا جائے، عقل کی رسائی محدود ہے اور انسانی تجربات غلطیوں سے بالکل محفوظ نہیں ہوتے، مشاہدات میں بھی بسا اوقات دھوکا ہوتا ہے، یہی حال ہمارے باطنی واردات اور اندرونی محسوسات کا ہے، بعض وقت ہمارے خیالات اور ذہنی رجحانات کشفی مشاہدہ بن جاتے ہیں، حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ہی کشف کو کفش زنی کے لائق قرار دیا ہے، دراصل وحی کے سوا علم کا کوئی ذریعہ بھی بے خطا نہیں ہے، کتاب الٰہی کے ساتھ کائناتِ ربانی پر غور وخوض، نتائج واکتشافات کو

حقیقت سے دور نہیں ہونے دیتا ہے، ورنہ عقل بے زمام کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے، البتہ غور و خوض، جمود و تنگ نظری سے پاک ہو، ماضی کے تجربات پیش نظر رہیں، لیکن زنجیر پا نہ بننے پائیں، بنیادی عقائد میں ثبات و استحکام ہو، اوامر و نواہی کا لحاظ رکھا جائے اس کے بعد عقل و تجربہ کی روشنی میں کائنات کا مشاہدہ کیا جائے، اور ان اصول و قواعد کا پتہ لگایا جائے، جو اس عالم میں جاری و ساری ہیں، کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اسکا باعث کوئی بے شعور مادہ نہیں ہے، بلکہ سب ایک علیم و بصیر ذات کی کارفرمائی ہے، دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ ان مقررہ اصول و قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو خالق کائنات نے وضع کئے ہیں۔ اسی طرح عالم بالا سے جو احکام نازل ہوتے ہیں وہ بھی ایک مرتب سلسلۂ اسباب کے ماتحت ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحؒ نے اس بارے مین اپنا ذاتی تجربہ ان الفاظ مین بیان کیا ہے۔

"اس چیز کا میں نے بارہا مشاہدہ کیا ہے، ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ چند آدمی آپس میں لڑ رہے تھے، اور حسد کی آگ ان میں حد درجہ مشتعل ہو گئی تھی، میں نے بارگاہ الٰہی میں اس حسد کے رفع ہونے کی التجا کی، اسوقت میں نے ایک نورانی مثالی نقطہ دیکھا جو . . . . . زمین پر اترا۔ اترنے کے بعد اس نے پھیلنا شروع کر دیا، یہانتک کہ جب وہ پوری طرح زمین پر پھیل گیا، ان لوگون کے قلوب حسد سے پاک و صاف ہو گئے، اور ہم مجلس سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ انمیں لطف و محبت کی برکتیں پیدا ہو گئین، . . . . . اس بارے میں عقل کی بات یہ ہے کہ وہ مخلوق جو اوپر سے اترتی ہے اسباب عادیہ میں سے ایک سبب کی حیثیت رکھتی ہے۔"

یہ دنیا عالم اسباب ہے، اسکا نظام اس نہج پر وضع کیا گیا ہے،

کہ مادہ مین اُس وقت تک کوئی حرکت ممکن نہیں ہے، جب تک کوئی سبب اس سے وابستہ نہ ہو، جب کائنات میں سبب اور نتیجہ کا قانون کام کر رہا ہو تو حوادث و واقعات کے اسباب کو دریافت کئے بغیر دنیا کے ذخائر سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور کیونکر اللہ کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھین اسباب مین تسخیر کائنات کا جواز موجود تھا، یہ مقدس راہ قرآن مجید نے تجویز کی تھی، اسی سبق کو بھلا کر ہم دوسروں کے دستِ نگر ہو گئے، اور سب سے بڑا خسارہ یہ ہوا کہ جو دین پوری زندگی پر محیط تھا، وہ چند رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا۔

مندرجۂ بالا تحریر سے نہ تو مروجہ تعلیمی نظام پر کوئی تخریبی تنقید مقصود ہے، اور نہ کسی قسم کی نشتر زنی سے شخصیتون کو مجروح کرنا ہے، بات صرف اتنی سی ہے کہ قرآن کریم مین جتنی آیتیں شرعی احکام و فرامین سے متعلق ہیں، ان سے ۵ گنا زیادہ عجائبات قدرت پر غور و خوض کی دعوت دے رہی ہیں، اس صورت حال کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے، البتہ جن علامات کو محور فکر بنانے پر اصرار ہے، اُن کے متعلق تفصیلی معلومات کی فراہمی ناگزیر ہے اس کے بغیر فکر کے لئے راہ ہموار نہیں ہو سکتی، شب و روز کے نت نئے انکشافات و تحقیقات سے علم کا دریا وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، اب ضرورت ہے، کہ کائنات میں از سالمہ تا انسان جو نظام قائم ہے، اس کی جھلکیاں نظر آنے لگین ایک نصاب تیار ہو اور ہمارے تعلیمی نظام میں اسکا مقام متعین ہو جائے تاکہ طلبہ کو فکر کیلئے مواد اور اس کی مشق کے لئے ذرائع فراہم ہو سکین۔ ظاہر ہے کہ اس قلیل عمر مین کوئی فرد سارے علوم کا ماہر نہیں بن سکتا البتہ باہمی تعاون ہی سے کوئی راہ نکل سکتی ہے۔

بچون کی تعلیمی تنظیم کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ قابلِ توجہ ہے۔

مسلمان بچوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد اس مفروضے پر قائم کی جاتی ہے کہ مسلمان گھر میں پیدا ہونا ہی دائرۂ اسلام میں داخلے کی ضمانت ہے، اس طرز استدلال کے تحت اگر روز اول سے احکام کا سلسلہ نازل ہونا شروع ہو جاتا، اور اُن احکام کو بزور نافذ کیا جاتا تو بعض اوقات اسکا ردعمل شدید بغاوت کی شکل اختیار کرتا کیونکہ یہ دین بچے کو وراثت میں ملا ہے، غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا، اکثر پرہیزگار گھرانوں کے ذہین فرزند اسی وجہ سے لادینیت کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ ایک بڑا المیہ ہے۔

دراصل اسلامی فکر و عمل کا منبع وہ یقین محکم ہے جو وجود باری تعالےٰ کے اقرار سے متعلق ہے، جب تک اس اقرار کا حق ادا نہ ہو اُس وقت تک عقیدہ اور عمل میں اخلاص پیدا نہیں ہوتا، حق اس کا یہ ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کو ہم اس طرح مانیں جیسے آنکھ سے دیکھ رہے ہوں اور اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو اتنا ضرور یقین ہو کہ وہ ہم کو دیکھ رہا ہے، اگرچہ یہ کیفیت توفیق الٰہی کی محتاج ہے، پھر بھی سازگار ماحول اور مناسب تعلیم کی اہمیت کم نہیں کی جاسکتی۔

خوردسالی میں کلمۂ طیبہ کے قولی اقرار سے بلاشبہ بچہ مسلمان تو ہو جاتا ہے، مگر "اٰمَنُوْا" کا تقاضا اسی وقت پورا کر سکتا ہے، جب سنِ شعور کو پہونچے اس کی عقل بالغ ہو جائے اور اُس پر فہم و فراست کے دروازے کھلنا شروع ہو جائیں، یہی وہ وقت ہے، جب کہ خداوند عالم کی تلاش ہو، مگر چونکہ ذات حقیقی پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے، وہ اس عالم اسباب میں نظر نہیں آسکتی، اس لئے لازم ہے کہ اس کے حکم کے بموجب اس کی نشانیاں اس کی قدرت کے مظاہر میں تلاش کیجائیں، جن کا ادراک قطعی طور پر ہمارے حواس سے ممکن ہے، یہی نشانیاں اس کے وجود، اس کی حکمت، اس کی

تدبیر و تقدیر پر پوری پوری دلالت کرتی ہیں، اور یہی قوت دلالت اس کے سوئے ہوئے ذہن کو جھنجھوڑ کر بیدار کر سکتی ہے، انواع و اقسام کی نشانیاں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے باقاعدہ تعلیم کی ضرورت ہے، کبھی یہ نشانیاں حیوانات کے عجائب میں نظر آتی ہیں، جس کی مثال ایک فاضل ماہر حیوانات جے۔ آر۔ نارمن کے اس بیان سے واضح ہو جاتی ہے، جس کو انھوں نے اپنی ایک درسی کتاب میں شایع کیا ہے، لکھتے ہیں:

"زینزی بار (Zanzibar) کے مچھلی بازار میں مچھلی کا ایک ایسا نمونہ آیا جسکی دم پر کچھ نشانات پائے گئے، جن کی حیرت انگیز مشابہت عربی کی اس عبارت سے تھی کہ دم کی ایک طرف لا الٰہ الا اللہ اور دوسری طرف شان اللہ پڑھا جاتا تھا"

اسی طرح کی ایک اور مچھلی مبئی کے مچھلی گھر میں آج بھی موجود ہے، جو شان اللہ کے نام سے مشہور ہے۔

اللہ کی یہ نشانیاں کبھی کبھی اس طرح بھی ظاہر ہوتی ہیں کہ غیبی پردے اٹھا کر ان کیفیات کا عمومی مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے، جو بظاہر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں، عراق کا وہ واقعہ جس میں دو جلیل القدر صحابیوں کے جسد اطہر کو تازہ ترین حالت میں قدیم مزارات سے ۱۹۳۲ء میں نکال کر دوسرے محفوظ مقام پر دوبارہ سپرد خاک کیا گیا، ہماری یادداشت میں اب بھی محفوظ ہے۔

اب تک اتنا تو معلوم تھا کہ بعض اوقات خشک ریگستانی علاقوں میں مردہ جسم کا پانی جلد خشک ہو جانے اور فضائی ماحول کے زیر اثر کھال سکڑنے اور ہڈیوں کے ڈھانچ

پر منڈھ جانے سے ایک بدنما سی 'قدرتی ممی' تیار ہو جاتی ہے، جو سالہا سال تک زمین میں دفن رہ سکتی ہے۔ مگر مرطوب زمین میں چودہ سو سال تک مردہ جسم کا اس طرح محفوظ رہنا کہ ہر ہر عضو تازہ ترین حالت میں نکلے ایک ایسا مظہر ہے، جس کی توجیہہ کرنے سے سائنس قاصر ہے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں بلکہ واقعہ ہے، و راقم کے پاس اس موقع کے منظر کا ایک فوٹو موجود ہے جو جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ یہ واقعات صرف متحیر کرنے کے لیے ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام کی حقانیت پر دلالت کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس ملک کی سرکاری سطح پر اس واقعہ کی پوری چھان بین کی جائے اور ایک کتابچہ کی شکل میں پوری ذمہ داری کیساتھ لوگوں کے سامنے رکھا جائے، تاکہ ایمان والوں کا یقین تازہ ہو، اور جو اس نعمت سے محروم ہیں اُن کی فکر کے لیے غذا فراہم ہو۔

پھر اللہ سے تعلق کے لیے اس کی توفیق کے علاوہ مشاہدے اور تجربے کی بھی ضرورت ہے جس کا براہ راست تعلق تعلیم و تربیت سے ہے، جب ہم اس نقطۂ نظر سے اپنے ملک میں بچوں کی تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے، عمر کا یہی وہ نازک دور ہے، جس کو جس رنگ میں چاہیں رنگ سکتے ہیں، ماہر نفسیات ایرکسن (Erickson) کے خیال کے مطابق ۷-۱۱ سال کے بچے میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ چیزوں کی بناوٹ اور طریقہ کار پر غور کر سکے نیز استخراجی استدلال کی صلاحیت (Deductive reasoning) بھی اسی عمر سے شروع ہو جاتی ہے۔ مزید براں تجسس انسان کا ایک فطری تقاضا ہے۔ بچوں میں یہ کیفیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، کسی بھی ماحول کا پروردہ ایک سات سالہ بچہ ہر نئی چیز دیکھ کر کس قدر سوچتا ہے، وہ اپنی استطاعت کے

مطابق اس کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتا ہے، یہ صفت کسی قوم یا نسل سے وابستہ نہیں، اور نہ کسی ملک کا اجارہ ہے، بلکہ یہ انسانی فطرت کی ایک بنیادی حقیقت ہے، جو تربیت پاکر پروان چڑھتی ہے، اور اگر اس کو جلا نہ دی جائے تو معدوم ہو جاتی ہے، لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ یہ شمع جو قدرت نے بچے کے دل میں روشن کی ہے اس کی تابناکی اس کی عمر کے ساتھ بڑھتی جائے، اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ مخلوقات کے 'چلتے پھرتے' ایسے نمونے اس کے سامنے رکھے جائیں جن سے خدا کی قدرت اور اس کے وجود کا پتہ چلے تاکہ اس کے تجسس میں اضافہ ہو اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو اور یہی نمو پاکر اس کا مزاج بن جائے۔ اس طرح جب اللہ کا تعارف اس کی مخلوقات کے ذریعہ بچوں سے کرایا جائے گا، تو ان کے تحت الشعور کی صف اوّل میں اللہ کی صنعت اور عظمت کا ایسا نقش قائم ہوگا جو عمر کے ساتھ ابھرتا جائے گا، اور مظاہر قدرت کی توجیہ کرتے وقت امید ہے کہ یہی رنگ غالب رہے گا۔

علمِ حیاتیات اس سلسلے میں دلچسپ تجرباتی ساز و سامان اور بیش بہا معلومات فراہم کر سکتا ہے، مثلاً ایک نئی زندگی کی تخلیق کے مختلف مراحل مرغی کے انڈے توڑ کر باسانی دکھائے جا سکتے ہیں، جو ۷-۱۱ سال کے بچوں کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہوں گے، استاد کا یہ کام ہوگا کہ وہ انڈے کی زردی اور سفیدی کی نفی کر کے اللہ کی قدرت کا نقش بچوں کے ذہن پر ثبت کر دے۔ معمولی سی ٹریننگ کے بعد اچھے اساتذہ بھی تیار

---

۵ ملاحظہ ہوں تدریسی طریق کار کے وہ عام اصول جو اہلِ مغرب کے تعلیمی اداروں میں صدیوں سے معروف و مقبول رہے ہیں (مثلاً تدریسی عمل کے دوران طلبہ کی ذہنی حرکت، معلوم سے نامعلوم کی طرف، خصوصیت سے عمومیت کی طرف، مرئیات سے غیر مرئیات کی طرف ہونی چاہیے)

ہو سکتے ہیں، اور مل جل کر ایک مفید نصاب بھی تیار ہو سکتا ہے۔ ہمارے رسول اکرمؐ کا فرمان ہے۔

"فکر و تدبر کی ایک ساعت ۶۰ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

ایک بار حضرت علیؓ کے سوال کے جواب میں اپنے اسی ارشاد کی وضاحت کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے ۱۰ باتیں فرمائیں جن میں دوسری بات یہ تھی۔

"عقل میرے دین کی اصل ہے۔"

عقل اور دین کے اس رشتہ کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالےٰ کے یہاں ساری نعمتوں کے ساتھ عقل جیسی نادر نعمت کا حساب بھی دینا پڑے گا۔

مندرجہ بالا تحریر کے پیش نظر مندرجۂ ذیل نکات قابل غور ہیں۔

(۱) علم کو دو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے جو ثنویت عمل میں آئی ہے اُس کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔

(۲) قدیم اور جدید کتابوں میں ان عنوانات پر نظر ثانی کی جائے، جن کا تعلق سائنس سے ہے، اور جن کو بعد کی تحقیق نے غلط ثابت کر دیا ہے، (علامہ طنطاوی جوہری کی تصنیف جواہر العلوم مثال کے طور پر)

(۳) دینی مدارس میں فکری مباحث کے ساتھ ساتھ جدید آلات کے ذریعہ تجربہ اور مشاہدہ کو فروغ دیا جائے، (طاقتور دوربین کے ذریعہ اجرام فلکی کا مطالعہ ہو، اسی طرح خوردبین وغیرہ کا استعمال کیا جائے)

(۴) جدید علوم کے ذریعہ قرآنی آیات کی تفسیر کرتے وقت اکثر تصنیفات میں غلو کا پہلو نمایاں رہا ہے، اس سے احتراز کیا جائے، صرف انھیں آیات کو موضوع

بنایا جائے، جو مستند تحقیق کے ذریعہ تشریح طلب ہوں،

(۵) فکری ریاضت کے لیے نیا ادب تیار ہو، رسائل کی فراوانی کے پیش نظر چند معیاری مدرسے وجود میں آئیں، جن میں تجربہ کی خاطر نئی تعلیم کا انتظام ہو، تصنیف کا ایک سلسلہ بعنوان حیاتیات اور اسلام اور فلکیات اور اسلام وغیرہ شروع ہو۔

(۶) اعتقادات میں توہم کا عنصر داخل ہو گیا ہے، جذبات کے امتزاج سے اس کی خوب نشو و نما ہوئی ہے، اب اس سے احتراز ضروری ہے، کیونکہ موجودہ دور میں کوئی قوم ان روایات پر زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ ان حیرت انگیز اور جذبات آفریں اخبار و قصص کی پوری چھان بین کی جائے۔

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

مولفہ۔ مولانا ابو الحسنات ندوی، مرحوم،

ہندوستان کی قدیم تاریخ کی فارسی کتابوں میں جو عہد مغلیہ میں یا اس کے بعد لکھی گئی ہیں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا حال، جو خود دلی اور اس ملک کے مختلف شہروں میں قائم تھیں، اور ان میں ماہرین تعلیم اساتذہ کی نگرانی میں درس و تدریس کا کام زور شور سے جاری تھا، معلوم کرنا چاہیں، تو ہمیں بہت زیادہ کامیابی نہیں ہو سکتی، مولانا ابو الحسنات ندوی مرحوم سابق رفیق دار المصنفین نے اپنے زمانۂ رفاقت میں سید صاحب مرحوم کے ایما سے ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر نہایت تلاش و تحقیق سے ایک مقالہ لکھا تھا، جو باقساط پہلے معارف میں شائع ہوا اور اسکو اہل نظر نے بے حد پسند کیا، اور مقالہ نگار کو داد دی اور اسی کو سید صاحب نے مصنف کی یادگار میں اپنے گرانقدر مقدمہ کے ساتھ نہایت اہتمام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا، یہ بھی بہت مقبول ہوا،

یہ اسی کا دوسرا اڈیشن ہے، قیمت چار روپے، ستر پیسے،

ابن جزار قیروانی

از جناب اطہر ریحان صاحب فلاحی، طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلمان اطباء میں ابن جزار قیروانی بڑی اہمیت رکھتا ہے، طب کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی اس کی کئی قابل قدر تصانیف ہیں، ان میں سے بعض شایع ہو چکی ہیں، اور بعض قلمی شکل میں مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں، بچوں کے نشو و نما اور علاج پر سیاستہ الصبیان و تدبیرہم کے نام سے انھوں نے ایک اہم کتاب لکھی تھی، کئی برس ہوئے ڈاکٹر محمد حبیب الہیلہ نے اسے بڑی تحقیق کے ساتھ ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، اور اس پر بڑا پُر مغز مقدمہ لکھا ہے، ذیل کی سطور میں اس فاضلانہ مقدمہ، ڈاکٹر حسن حسنی عبد الوہاب کی کتاب اور دوسرے مقالات و کتب کی مدد سے اس نامور عالم اور صاحب نظر طبیب کے حالات لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تونس کے شہر قیروان کے ایک علمی خانوادہ میں ۲۸۵ھ/۸۹۵ء میں ابن جزار پیدا ہوا، اس کا پورا نام ابو جعفر احمد بن ابراہیم بن خالد بن جزار ہے جسے اہل یورپ Algizar کے نام سے جانتے ہیں، وہ ایک ایسے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جس کا علم طب سے بڑا گہرا تعلق تھا، اس کے والد ابراہیم اور چچا ابو بکر محمد دونوں ہی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے،

ابن جزار نے اگرچہ اپنے والد سے بھی علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن زیادہ تر چچا کے درس سے استفادہ کیا، ابن جزار نے اپنی کتاب "طب المشائخ" میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ عبیدی سلاطین کے طبیب خاص حکیم اسحٰق بن سلیمان کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا[1]۔ یہ وہ زمانہ ہے، کہ یہ زیادۃ اللہ ثالث سے ملنے مصر سے قیروان آئے تھے،

تعلیم سے فراغت کے بعد اس نے مطب کھولا جس سے ملحق ایک دواخانہ بھی قائم کیا، جس کا انتظام اس کے غلام رشیق کے سپرد تھا، کچھ ہی عرصہ میں ابن جزار کی حذاقت کا شہرہ ہو گیا، اور اس نے بڑے معرکے کے علاج کیے، بعض مورخین نے اس کی بعض غلطیوں کا ذکر بھی کیا ہے، مگر یہ بیانات صحیح نہیں ہیں۔

طبی علوم میں مہارت کے ساتھ دوسرے علوم سے بھی وہ آشنا تھا، اس کا اندازہ اس کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔

فن تاریخ میں اس کی کتابیں بعد کی بہت سی تاریخی کتابوں کے لیے مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں، اس کی کتاب اخبار الدولہ یاقوت حموی کی معجم البلدان کے مراجع میں داخل ہے، ابن ابی اصیبعہ اور مقریزی نے بالترتیب عیون الانباء اور اتعاظ الحنفاء کی تالیف میں اس کتاب سے بڑی مدد لی ہے، اس کی دوسری تالیف التعریف بصحیح التاریخ سے مالکی، قاضی عیاض، دباغ، ابن فرحون نے بالترتیب اپنی کتابوں ریاض النفوس، المدارک، معالم الایمان، الدیباج کی تصنیف میں استفادہ کیا ہے، نیز ابن حیان اور ابن خلکان نے اپنی تالیفات المقتبس اور وفیات الاعیان میں اسے مصدر اور مرجع کی حیثیت دی ہے۔

---

[1] مقدمہ سیاستہ الصبیان و تدبیرہم ص ۲۰

اس کی کتاب طبقات القضاۃ سے قاضی عیاض نے اپنی کتاب المدارک میں بہترے اقتباسات لئے ہیں، اس کی ایک مشہور کتاب مغازی افریقیہ کا حوالہ ابوعبید البکری نے اپنی مایہ ناز تصنیف المسالک والممالک میں دیا ہے۔[1]

طبیب اور مورخ ہونے کے ساتھ حسن لطیف اور ادبی ذوق بھی اسے فطرۃً ودیعت تھا، اس کی ادبی تصنیفات کی فہرست بھی طویل ہے، اس کی کتابیں المکلل، الفصول فی سائر العلوم والبلاغات، رسالۃ فی الاستہانۃ بالموت۔ اس کے ادبی ذوق کا شاہکار ہیں، اس کی ادبی دلچسپی اور اس میں دسترس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ایک مرتبہ ابوعبداللہ القزاز کی کتاب الحروف اس کی نظر سے گزری تو اس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "میرے علم میں کوئی ایسا نحوی نہیں جس نے اس کتاب سے بڑھ کر کچھ لکھا ہو"۔[2]

ابن جزار کی علمی ہمہ جہتی کا اعتراف اس لئے اور بھی کرنا پڑتا ہے کہ اس نے فلسفہ، تجربات اور عطریات پر بھی کتابیں اور کتابچے لکھے ہیں۔

مزاج ابن جزار ایک سنجیدہ، خاموش طبع اور بااخلاق شخص تھا۔ تاریخ وسیر کی کتابیں اس کی عظمت مرتبت کی معترف ہیں۔ دنائت اور پستی کردار سے اس کا دامن پاک ہے، وہ امرا اور سلاطین کے یہاں حاضری نہ دیتا تھا، خلیفہ معز کے چچا ابوطالب فاطمی کے یہاں اس کی آمد ورفت تھی، مگر یہ امارت وریاست کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ مورخین نے تصریح کی ہے کہ ان دونوں کے درمیان دوستانہ روابط تھے۔[3]

---

[1] مقدمہ سیاسۃ الصبیان ص ۳۰ از ڈاکٹر محمد حبیب الہیلہ۔ [2] عیون الانباء از ابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۳۷۔ [3] مقدمہ سیاسۃ الصبیان وتدبیرہم از استاذ محمد حبیب الہیلہ طبع ۱۹۶۵ء تیونس

مہارت فن اور استغناء ابن جزار کی طبی مہارت کی بڑی شہرت تھی، اس کا مطب مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔ لیکن وہ حریص اور طماع نہیں تھا۔ معائنہ اور تشخیص کے بعد وہ مریضوں کو اپنے غلام رشیق کے حوالہ کردیتا تھا، وہی انھیں دوائیں دیتا تھا، اور واجبی قیمت وصول کرتا تھا، خود ابن جزار کبھی بھی کسی سے کوئی فیس یا نذرانہ نہیں لیتا تھا، اس کے نزدیک بحیثیت مریض غریب وامیر چھوٹے بڑے سب یکساں تھے۔

ایک بار ابن جزار کے مطب میں قاضی نعمان[1] بن محمد منصور کا بھتیجا آیا۔ بھیڑ کی وجہ سے اسے کوئی نشست نہ مل سکی مگر قاضی صاحب کی اہمیت کے باوجود ابن جزار نے معائنہ میں مریضوں کی ترتیب کا لحاظ رکھا، اور باری سے پہلے ان کے قارورہ کا معائنہ نہیں کیا، نسخہ لکھا، تشخیص کے بعد وہ دوا لیکر چلا گیا، اور جب تک مکمل طور پر صحت حاصل نہیں ہوئی برابر آتا رہا۔ راوی کا قول ہے کہ حصول صحت کے بعد ایک صبح قاضی نعمان کا نوکر شکریہ کا خط اور ایک رومال جس میں تین سو مثقال کی ایک تھیلی لپٹی ہوئی تھی لیکر ابن جزار کے پاس حاضر ہوا، ابن جزار نے خط کے جواب کے ساتھ وہ تھیلی جوں کی توں واپس کردی اور کسی طرح اسے قبول کرنے پر راضی نہ ہوا۔[2]

ابن جزار کو زندگی ہی میں بڑی شہرت ونیک نامی حاصل ہوئی، اموی خلیفہ حکم خود بڑا ذی علم تھا، اور اہل علم کی بڑی قدر کرتا تھا، اس کی بڑی خواہش تھی کہ ابن جزار اسکے دربار سے وابستہ ہوجائے مگر وہ قیروان چھوڑ کر نہ آسکا۔[3]

وفات ابن جزار نے ۳۶۹ھ میں وفات پائی، انتقال کے بعد جب اس کے سامان کا جائزہ لیا گیا تو عام استعمال کی چیزوں کے علاوہ ۲۴ ہزار دینار نقد اور تقریباً

---

[1] عبیدیوں کے ایک مشہور قاضی القضاۃ تھے۔ [2] طبقات ابن جلجل ص ۸۸ تا ۹۰۔ [3] ریاض النفوس ج ۱ ص ۱۰۱

۲۰- کونسٹل کتابون کا بیش بہا ذخیرہ ملا۔[1]

وفات کی کوئی متعین تاریخ مورخین نے نہیں لکھی۔ اس سلسلے میں بڑے اختلافات ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ ابن جزار کی موت تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں واقع ہوئی۔ یاقوت حموی اور صفدی نے اتنے پر اکتفا کیا ہے کہ ۳۵۰ھ تک زندہ رہا۔ البتہ ابن عذاری نے البیان المغرب میں ۳۶۹ھ سال وفات لکھا ہے۔ حاجی خلیفہ نے اپنی مشہور کتاب کشف الظنون میں تقریباً ۸ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے مختلف بیانات میں اس قدر اضطراب ہے کہ کسی ایک متعین تاریخ کو ترجیح دینا مشکل ہے، انھوں نے ایک عجیب بات یہ بھی لکھی ہے کہ اس کی موت اندلس میں قتل کے سبب ہوئی لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ اندلس کبھی گیا ہی نہیں، ایسا لگتا ہے کہ حاجی خلیفہ نے ابن جزار اور ابو عثمان الجزار جو کہ اندلسی طبیب تھا کے متعلق مباحث کو گڈمڈ کر دیا ہے، بروکلمان نے متعین تاریخ وفات ۴۰۰ھ مطابق ۱۰۰۹ء لکھی ہے۔

ان تمام بیانات میں ابن عذاری کی رائے قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے، اسکے کئی قرائن موجود ہیں (۱) ابن عذاری نے ابراہیم[2] بن القاسم الرقیق سے روایت کی ہے، جو کہ قیروانی ہونے کے ساتھ ابن جزار کے معاصر بھی ہیں (۲) ابن جزار کی وفات ۳۷۰ھ سے قبل ہوئی، یہی تاریخ ابن جلجل کی کتاب کی تالیف کی بھی ہے، ابن جلجل نے بھی ابن عذاری کی وفات ۳۶۹ھ لکھی ہے، جس سے ابن عذاری کے

[1] مقدمہ سیاستہ الصبیان وتدبیرہم ص ۳۳ [2] ابو اسحاق ابراہیم بن القاسم الرقیق مراد ہیں جو کہ ایک افریقی مورخ تھے، ان کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی بروکلمان ج ۱ ص ۲۵۲

قول کی تائید ہوتی ہے، (۳) ابن جزار قزاز کی کتاب الحروف سے واقف تھا، اور یہ کتاب خلیفہ معز العبیدی کی خواہش پر لکھی گئی تھی، جو کہ ۳۶۱ھ میں مکمل ہوئی تھی، (۴) ڈاکٹر حسن حسنی عبد الوہاب[1] نے ابن جزار کی تاریخ پیدائش کی جو تعیین کی ہے یعنی ۲۸۵ھ، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۳۶۹ھ میں ابن جزار کی عمر لگ بھگ ۸۰ سال تھی، اس سے ابن ابی اصیبعہ کے مذکورہ بیان کی بھی قدرے تائید ہو جاتی ہے، تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کی تعیین کے بعد مقریزی کا یہ بیان غلط معلوم ہوتا ہے کہ منصور عبیدی کی وفات کے وقت ابن جزار نوجوان تھا،[2] درحقیقت اس وقت ابن جزار کی عمر تقریباً ۵۶ سال تھی۔

ابن جزار کی تصنیفات بکثرت ہیں، جن میں بیشتر فن طب سے متعلق ہیں کچھ ادب، فلسفہ اور تاریخ کے موضوعات پر بھی ہیں، ابن جزار کی کتابوں کی فہرست ابن ابی اصیبعہ نے اپنی مشہور کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء میں شایع کی ہے، لیکن وہ فہرست نامکمل تھی، ڈاکٹر حسن حسنی عبد الوہاب نے اپنی کتاب[2] میں ان کی کتابوں کی لمبی فہرست دی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس کی بعض اور اہم کتابوں کا پتہ لگا کر استاد محمد حبیب الهیلہ نے پوری فہرست شایع کر دی ہے، ذیل میں پوری فہرست مختصر تعارف کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔

(۱) الاعتماد فی الادویۃ المفردہ۔ اس کتاب کا ذکر تقریباً تمام ہی مورخین[3] اور سوانح نگاروں نے کیا ہے، جن میں ابن ابی اصیبعہ، یاقوت الحموی، الصفدی

[1] ورقات، از ڈاکٹر حسن حسنی عبد الوہاب، ص ۵۱۳ [2] ایضاً ص ۳۲۰،

[3] عیون الانباء ج ۲ ص ۳۷، معجم الادباء ج ۲ ص ۱۳۶، الوافی بالوفیات ص ۲۲۳ ج ۱، کشف الظنون ص ۱۲۰، ہدیۃ العارفین ص ۱۰

حاجی خلیفہ اور البغدادی وغیرہ شامل ہیں، یہ کتاب چار مقالات پر مشتمل ہے، مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابن جزار نے یہ ایک عبیدی خلیفہ کے لیے لکھی تھی، اس کتاب کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی زبانوں میں بھی کیا گیا ہے۔[۱]

(۲) الخواص:[۲] اس کتاب کا ذکر ابن ابی اصیبعہ کے علاوہ حاجی خلیفہ اور البغدادی نے بھی کیا ہے، اور اس کے لاطینی نسخہ کا ذکر بروکلمان میں بھی ملتا ہے۔

(۳) رسالۃ فی ابدال الادویہ:- اس مخطوطہ کا ذکر بھی مذکورہ بالا مورخین کے یہاں ملتا ہے، افسوس ہے کہ یہ کتاب شائع نہ ہوسکی، اس کا ایک نسخہ دار الکتب مصر میں بدل العقاقیر کے نام سے موجود ہے، دوسرا نسخہ برلن میں ہے، جس پر کتاب الابدال نام پڑا ہوا ہے، تیسرا نسخہ اسکوریال میں ہے جس کا ذکر بروکلمان نے ابدال العقاقیر کے نام سے کیا ہے، مصری لائبریری کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی استاد حسن حسنی عبد الوہاب کے ذاتی کتب خانہ میں بھی ہے۔

(۴) زاد المسافر وقوت الحاضر:[۳] یہ ابن جزار کی بڑی اہم تالیف ہے، اس کا ذکر صاعد، ابن ابی اصیبعہ، یاقوت، حاجی خلیفہ کے علاوہ الصفدی کے یہاں بھی ملتا ہے،[۴] اس کے مختلف نسخے رباط کے خزانہ عامہ، دار الکتب مصر، تہران کے مکتبہ ملک، پیرس کی نیشنل لائبریری میں موجود ہیں، اس کتاب کی ایک تلخیص اسکوریال میں موجود ہے، یہ کتاب ابن جزار کی وفات سے قبل شائع ہوئی تھی، اس پر شاعر کشاجم[۵] نے تقریظ کے طور پر چند اشعار لکھے تھے، جسے محمد حبیب الہیلہ نے نقل کیا ہے۔[۶]

---

۱ مقدمہ سیاستہ الصبیان ص ۳۸ ۲ عیون الانباء ج ۲ ص ۳۹ ۳ معجم الادباء ج ۲ ص ۳۲ ۴ الوافی بالوفیات ص ۳۳، کشف الظنون ص ۱۴۰، ہدیۃ العارفین ص ۔ ۵ مقدمہ سیاستہ الصبیان ص ۴۲ ۶ ابو الفتح کشاجم چوتھی صدی کا ایک قادر الکلام شاعر تھا جس کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی، ۷ سیاستہ الصبیان ص ۴۲ بحوالہ عیون الانباء

ابا جعفر ابقیت حیا ومیتا	مفاخر فی ظہر الزمان عظاما
رأیت علی زاد المسافر عندنا	من الناظرین العارفین زحاما
فایقنت ان لو کان حیا لوقتہ	یوحنا[۸] لما سمی التمام تماما
سأحمد افعالا لاحمد لم تزل	مواقعہا عند الکرام کراما

اندلس میں اس کتاب کا تعارف ابن جزار کے ایک شاگرد رشید عمر بن حفص نے کرایا، جو عبد الرحمن الناصر کے طبیب خاص تھے، اس کتاب کا یونانی، عبرانی اور لاطینی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے، اس کے عبرانی نسخے آکسفورڈ، اور اٹلی کی دو لائبریریوں پارمہ (Parme) اور ٹورین (Turin) میں موجود ہیں، یونانی ترجمہ کے سات نسخے پیرس میں، دو نسخے انگلینڈ میں، دو فرانس میں، ۲ اسکوریال میں اور ایک میونخ میں موجود ہیں، اس کا لاطینی ترجمہ ۱۵۱۰ء میں پہلی بار شائع ہوا، انیسویں صدی کے نصف آخر سے محققین نے اس کی طرف توجہ کی، جرنل آف ایشیا ۱۸۵۳ء ج ا ص ۲۸۹ کے آگے ڈاکٹر گسٹیو ڈوگٹ (Dr. Gustau Dugel) نے تلخیص کے طور پر ایک جامع مقدمہ لکھا ہے، اور اس کتاب کے مضامین کے ابواب کی فہرست مرتب کی ہے، اس کے بعد مختلف لوگوں نے ضمنی اور تفصیلی طور پر اس کتاب پر ریویو لکھے ہیں، آخر میں ۱۹۶۶ء میں Dr. Aldert Dietric نے اپنی عربی طبی مخطوطات پر لکھی ہوئی کتاب میں نہ صرف یہ کہ اس کا ذکر کیا بلکہ اس کے ابواب کی فہرست بھی درج کی ہے۔[۹]

---

۸ یوحنا سے مراد یوحنا بن ماسویہ ہے، جو خلیفہ عباسی واثق باللہ کے دور میں تھا، جس کی وفات ۲۴۳ھ میں ہوئی، الکمال والتمام اس کی کتاب ہے جسے شاعر نے نظم کیا ہے، طبقات ابن جلجل ص ۶۶ ۹ مقدمہ سیاستہ الصبیان ص ۱۴

(۵) سیاسۃ الصبیان وتدبیرہم :- قدیم مصادر میں اس کتاب کا ذکر نہیں ملتا
لیکن ڈاکٹر حسن حسنی عبدالوہاب نے لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ اسکو ریال میں موجود ہے،
اس مخطوطہ کو بڑی محنت سے ایڈٹ کرکے ۱۹۶۵ء میں الدار التونسیہ للنشر سے پہلی بار
ڈاکٹر محمد حبیب الہیلہ نے شایع کیا ہے، یہ کتاب ۲۲ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے چھ ابواب
بچوں کے حفظ صحت، ولادت اور پرورش کے طریقوں پر مشتمل ہیں، اس کے بعد
اعضاء کی ترتیب کے ساتھ بچوں کے امراض اور ان کا علاج بیان کیا گیا ہے، آخری باب
کا کچھ حصہ مخطوطہ میں محفوظ نہیں رہ سکا تھا، لیکن بقیہ حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باب
بچوں کے چڑچڑے پن اور اس کے تدارک کے متعلق لکھا گیا تھا، یہ کتاب نہایت
آسان اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے، اس کے مباحث عام طور پر "ان شاء اللہ"
پر ختم ہوتے ہیں۔

حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابن جزار نے اس کتاب کی تالیف میں عام طور سے
فصول بقراط اور جالینوس کی تین کتابوں کتاب السیاسۃ، کتاب الادویۃ المبسوطۃ،
کتاب الصنعۃ الطبیۃ سے استفادہ کیا ہے، اس کے علاوہ فلسفی ابوراس یحیی بن ماسویہ، طبیب
ساموس اسحاق بن ماسویہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے[1]

طب اطفال کے موضوع پر یہ ایک بیش قیمت کتاب ہے اس کے پڑھنے سے اندازہ
ہوتا ہے کہ اس موضوع پر لکھی گئی پہلی جامع کتاب ہے اس کی طرف خود ابن جزار نے بھی مقدمہ
میں اشارہ کیا ہے،

"ولما اساکا احد من الاوائل المتقدمین فی ذالک کتابا کاملا

۱ مقدمہ سیاسۃ الصبیان ص ۵۲،

شافیا۔[1] یہی وجہ ہے کہ ابن سینا نے اپنی کتاب القانون میں اس کتاب کے اکثر مباحث
بالکل لفظ بلفظ نقل کیے ہیں[2]

اگرچہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ بات خارج از امکان بھی نہیں کہ اندلس میں
طب اطفال کے موضوع پر ریسرچ کے دوران ۱۹۵۱ء میں
نے اس مخطوطہ سے استفادہ کیا ہو کیونکہ اس وقت طب اطفال کے قدیم نظریہ سے واقفیت
کے لیے اس سے جامع کوئی کتاب نہیں تھی۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ابن جزار کی موجودہ تصنیفات کی فہرست حسب
ذیل ہے۔

(۱) طب الفقراء (۲) طب المشائخ (۳) کتاب فی الکلی والمثانی (۴) مداواۃ النسیان
(۵) المعتمد فی الادویۃ المفردۃ (۶) کتاب فی المعدہ وامراضہا (۷) کتاب فی الملخولیا۔

ان کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں بھی ہیں، جن کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے، لیکن تاریخ
کی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے، اور جن کی فہرست حسن حسنی عبدالوہاب کے علاوہ ڈاکٹر
محمد حبیب الہیلہ نے بھی شایع کی ہے[3]

(۱) الاخبار :- اس کتاب کا تذکرہ القفطی نے کیا ہے، انھوں نے بعض مباحث
اپنی کتاب میں اس سے نقل کئے ہیں، (۲) اخبار الدولہ :- یہ دولت فاطمیہ
کے عروج اور دولت عبیدیہ کے زوال کی تاریخ ہے، اس سے بعد کے مورخین نے واقعات نقل کئے
ہیں، جن میں مقریزی، ابن ابی اصیبعہ، یاقوت وغیرہ شامل ہیں۔ غالب گمان ہے کہ اس کا

۱ سیاسۃ الصبیان ص ۵۰، ۲ القانون ج ۱ ص ۲۲۰ تا ۲۲۵ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۳ کتابوں
کی یہ طویل فہرست محمد حبیب الہیلہ کی مرتب کی ہوئی کتاب سیاسۃ الصبیان کے مقدمہ سے ماخوذ ہے،

کوئی نسخہ اسماعیلیوں کے کسی خزانۂ کتب میں ہندوستان میں موجود ہوگا۔

(۳) اسباب الوفاۃ، (۴) اصول الطب، (۵) البغیۃ فی الادویہ المرکبۃ (۶) البلغۃ فی حفظ الصحۃ، (۷) التعریف بصحیح التاریخ، (۸) رسالۃ الادویہ (۹) رسالۃ فی الاستہانۃ بالموت، (۱۰) رسالۃ فی التحذیر من اخراج الدم، (۱۱) رسالۃ فی الزکام (۱۲) رسالۃ فی المقعدہ واوجاعہا، (۱۳) رسالۃ فی النفس (۱۴) رسالۃ فی النوم والیقظۃ (۱۵) طبقات القضاۃ (۱۶) عجائب البلدان (۱۷) العطر (۱۸) العدۃ لطول المدۃ (۱۹) الفصول فی سائر العلوم والبلاغات (۲۰) قوت المقیم (۲۱) کتاب السموم (۲۲) مجربات الطب (۲۳) المختبرات (۲۴) مغازی افریقیہ (۲۵) مقالۃ فی الجذام، (۲۶) مقالۃ فی الحمامات (۲۷) المکلل فی الادب، (۲۸) نصائح الابرار (۲۹) النصح (۳۰) الاسباب المولدۃ للوباء فی مصر وطریق الحیلۃ فی دفع ذالک،

ان عظیم کارناموں کی بنا پر ابن جزار کی ذات بجا طور پر باعث افتخار ہے۔

سلسلۂ صحابہ کرام و تابعین عظام و تبع تابعین کبار رحمہم اللہ تعالیٰ

اس سلسلہ میں ۱۵ کتابیں شامل ہیں۔ مہاجرین ۵ عدد، انصار ۲ عدد، سیر الصحابیات، اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات ۳ عدد، تابعین ۱ عدد، اہل کتاب صحابہ و تابعین ۱ عدد، تبع تابعین ۲ عدد، موخر الذکر کی دوسری جلد جو ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دار المصنفین نے لکھی ہے، زیر طبع ہے، اور عنقریب چھپکر منظر عام پر آرہی ہے، شائقین کو براہ راست بھی مل سکتی ہے اور الگ الگ اس کے تمام حصے بھی۔

"منیجر"

وفیات

مولانا عبدالعزیز میمن

چند یادیں

از جناب شیخ نذیر حسین، مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور

مولانا عبدالعزیز میمن نے نوے برس کی عمر میں ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

وہ عہد حاضر میں عربی زبان کے مشہور ادیب، محقق، عالم اور انشا پرداز تھے، اور اپنی عربی تصانیف کی بدولت ہند و پاکستان سے زیادہ عرب ممالک کے علمی حلقوں میں معروف اور روشناس تھے،

مولانا میمن صاحب کا وطن مالوف راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) تھا، جہاں وہ ۱۸۸۸ء میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے آبائی پیشہ زمینداری تھا، بچپن ہی میں وہ حصول علم کے لئے دہلی چلے آئے، ان دنوں دہلی علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا، شہر میں باکمال علماء کے درس و تدریس کے حلقے جگہ جگہ قائم تھے، میمن صاحب نے مولانا محمد بشیر سہسوانی سے جو نواب صدیق حسن کے زمانہ عروج میں بھوپال میں قاضی رہ چکے تھے، درسیات کی تحصیل کی، ادب کی تعلیم کے لیے وہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عربی علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد تھے، انھوں نے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند ڈپٹی صاحب سے پڑھیں، میمن صاحب بیان کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی، امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ایک دفعہ دہلی تشریف لائے تو ڈپٹی صاحب امیر حبیب اللہ خاں سے

ملنے گئے، اتفاق سے عید کا دن تھا، ڈپٹی صاحب نے متنبی کا عید اور دجہ حبیب والا شعر پڑھا، عید کے دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے عجیب لطف پیدا کر دیا، اور امیر صاحب بہت محظوظ ہوئے، اس زمانے میں معقولات کا بڑا شہرہ تھا، قدیم فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا، ان علوم کا سب سے بڑا مرکز مدرسہ عالیہ رام پور تھا، علامہ محمد طیب کی صدر مدرس تھے، جو بلند پایہ ادیب تھے، ان کی علمی شہرت کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبہ رام پور کھنچے چلے آتے تھے، میمن صاحب نے رام پور جا کر علامہ طیب صاحب سے استفادہ کیا اور فراغت کے بعد دہلی چلے آئے، جہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء میں پرائیوٹ طور پر پاس کیے اور یونیورسٹی میں اول آئے،

اس وقت شہر دہلی مجمع الکمال بنا ہوا تھا، بڑے بڑے علماء، ادباء اور صلحاء وہاں موجود تھے، لیکن مولانا میمن افسوس سے ذکر کیا کرتے تھے، کہ دہلی احناف اور اہل حدیث علماء کے فقہی اختلافات کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی، فریقین میں مناظرے ہوا کرتے تھے اور یہ مناظرے بسا اوقات مجادلے اور مقاتلے بن جایا کرتے تھے، وہ بیان کرتے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انتقال کیے ہوئے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گذر چکا تھا، لیکن لوگوں کے دلوں میں بہادر شاہ کی یاد تازہ تھی، اس کی یہ غزل:-

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ   نہیں دل کو میرے قرار ہے

بچے بچے کی زبان پر تھی۔ دہلی کا خونی دروازہ، جہاں شہزادوں کو سولی دی گئی تھی، زیارت گاہ عوام و خواص تھا، ارزانی کا یہ عالم تھا کہ مصر کی چھپی ہوئی صحیح بخاری ڈھائی تین روپے میں مل جاتی تھی۔

اسی اثنا میں ان کو مشن کالج پشاور میں عربی و فارسی کے لکچرار کی جگہ مل گئی، اور وہ پشاور چلے آئے، اس زمانے میں انھوں نے لاہور کے مشہور ادبی رسالہ مخزن میں عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر کئی مضامین لکھے، جن میں کافیہ اور شرح ملا جامی کے بجائے ابن ہشام کی کتابوں (شرح قطر الندی اور شرح شذور الذہب) اور الفیہ کی شروح کو اختیار کرنے اور منطق و فلسفہ میں زیادہ انہماک کے بجائے علم حدیث کے اشتغال اور مزاولت پر زور دیا گیا تھا،

اپریل ۱۹۲۱ء میں وہ مولوی محمد شفیع کی قدر دانی سے اورنٹیل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے تشریف لے آئے، یہ زمانہ اورنٹیل کالج کے شباب کا تھا، شعبۂ عربی میں مولوی محمد شفیع کے علاوہ مولوی نجم الدین اور مولانا سید محمد طلحہ (سید ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا) بھی تھے، جب کہ شعبۂ فارسی میں ڈاکٹر محمد اقبال (ڈاکٹر داؤد رہبر کے والد) اور سید وجاہت حسین بلگرامی (رام پوری) تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، ان اساتذہ کے علم و فضل اور تدریسی مہارت کی شہرت سن کر یو۔ پی، بہار، ریاست ہائے راجپوتانہ بلکہ حیدرآباد (دکن) تک سے بھی طلبہ لاہور کھنچے چلے آتے تھے، مولانا میمن کالج میں تدریس کے علاوہ اورنٹیل کالج کے ہوسٹل کے بھی نگران تھے، اس دور کے شاگردوں میں مولوی امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم اور ڈاکٹر سید عبداللہ قابل ذکر ہیں، سید صاحب بیان کرتے ہیں کہ مولانا میمن سبعہ معلقہ اس مہارت اور عمدگی سے پڑھاتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی، لاہور کے زمانۂ قیام میں انھوں نے مولوی محمد شفیع مرحوم کی ترغیب اور تشویق سے خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کا انڈکس کلید الخزانہ کے نام سے شائع کیا، مشہور عرب شاعر ابوالعلاء المعرّی کے حالات اور فلسفۂ شاعری

میں ابو العلاء المعری وما الیہ کے نام سے ایک جامع کتاب لکھی جو دارالمصنفین کی طرف سے قاہرہ سے چھپ کر شائع ہوئی، اس کے علاوہ انھوں نے ابن رشیق کے اشعار کا مجموعہ مختلف ادبی کتابوں کو کھنگال کر شائع کرایا۔ اورینٹل کالج میگزین کا اجرا ہوا تو مولوی محمد شفیع صاحب نے میمن صاحب کو بھی اردو میں لکھنے کی ترغیب دی اور ان کی ہر طرح سے علمی رہنمائی کی، حیرت ہے کہ میمن صاحب نے شفیع صاحب کے احسانات کا کبھی بھی اعتراف نہیں کیا۔ اس زمانے میں وہ معارف میں بھی لکھتے رہے۔

۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی اسامی خالی ہوئی تو وہ غالباً علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی سعی و سفارش سے علی گڈھ چلے گئے، میمن صاحب کے تقرر پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے معارف کے شذرات میں اظہار مسرت کیا تھا، میمن صاحب ۱۹۵۰ء میں صدر شعبۂ عربی کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے، ان کی آمد سے قبل عربی شعبہ کا صدر جرمن یا برطانوی مستشرق ہوا کرتا تھا، جس کی وجہ سے یہ شعبہ خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکا تھا۔ معیار تعلیم کی پستی کا یہ عالم تھا کہ ایم۔ اے (عربی) کے کورس میں بائبل کا عربی ترجمہ شامل تھا، میمن صاحب نے نصاب تعلیم کی اصلاح کی، عربی ادب کی امہات کتب، مثلاً الکامل (المبرد) اور کتاب العمدہ (ابن رشیق) نصاب میں داخل کیں، شعبۂ عربی کا وقار ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں قائم کیا اور طلبہ میں صحیح علمی ذوق اور ملکۂ تحقیق پیدا کیا۔ ان کے درس و تدریس سے بہت سے مستعد طلبہ نے فائدہ اٹھایا،

ان میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (حیدرآباد سندھ اب اسلام آباد) ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم (کراچی یونیورسٹی) ڈاکٹر مختار الدین آرزو (مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ) اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق (دہلی یونیورسٹی) قابل ذکر ہیں، افسوس ہے کہ ڈاکٹر محمد یوسف جن کو میمن صاحب بھی بہت مانتے تھے، ٹریفک کے حادثے میں گذشتہ ستمبر میں لندن میں انتقال کر گئے،

علی گڈھ کے قیام کے دوران میں ان کا قابلِ ذکر کارنامہ امالی القالی کی شرح کی اشاعت ہے، اس کی شرح ایک اندلسی عالم ابو عبید البکری نے للآلی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو نایاب تھی۔ میمن صاحب نے اس کے معتمد نسخے بہم پہنچائے، ان کے مقابلے اور تصحیح سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اس پر حواشی لکھے، شارح کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کی۔ اور ۱۹۳۵ء میں خود قاہرہ جاکر اس کو سمط اللآلی کے نام سے شائع کرایا۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ جو آیندہ چل کر عالم عرب میں ان کی شہرت اور تعارف کا ذریعہ بنی۔ امام عبدالقاہر الجرجانی نے ابو تمام، بحتری اور متنبی کے دواوین کا انتخاب الطرائف الادبیہ کے نام سے کیا تھا۔ یہ بھی اسی زمانے میں میمن صاحب کے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ شائع ہوا، الفتح کے فاضل مدیر محب الدین الخطیب کی فرمائش پر خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کی جدید اشاعت میں حصہ لیا۔ اس کی صرف چار جلدیں شائع ہوسکیں، یہ کتاب دیکھنے کو تو شیخ رضی کی شرح کافیہ کے شواہد کی شرح ہے لیکن حقیقت میں عربی ادب کا خزانہ ہے، جس سے کوئی ادیب مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اب اس کو مصر کے مشہور محقق عالم استاد عبدالسلام محمد ہارون جدید تحقیق، تصحیح اور تحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں، اور اس کی چھ سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

میمن صاحب نے مصری حکومت کے اصرار پر لسان العرب کی بھی تصحیح کی، لیکن اس کی صرف دو جلدیں شائع ہوسکیں، افسوس ہے کہ خطیب صاحب کی بے وقت موت کی وجہ سے یہ عظیم الشان کارنامہ ادھورا رہ گیا، ۱۹۵۰ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر بن کر پاکستان چلے آئے،

اس دور کا علمی کارنامہ دیوان حمید بن ثور الہلالی اور الفاضل (المبرد) کی اشاعت ہے۔
دسمبر ۵۸ء میں راقم کو ان کی زیارت اور ملاقات کا پہلی دفعہ شرف حاصل ہوا، اسلامی کلوکیم (مذاکرہ) لاہور میں بہت سے مستشرقین اور عرب ممالک کے متعدد فضلا مدعو تھے، جن میں نمایاں شخصیت شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد بہجت بیطار کی تھی، اس سے قبل میں ان کے علمی مقالات اور نئی کتابوں پر متوازن تبصرے مجمع العلمی العربی (دمشق) کے سہ ماہی مجلہ میں پڑھ چکا تھا اور ان سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا، چنانچہ میں استاد محترم شیخ محمد العربی المراکشی کی معیت میں فلیٹی ہوٹل پہونچا جہاں عرب مندوبین مقیم تھے، معلوم ہوا کہ شیخ محمد بہجت بیطار مولانا محمد ادریس کاندھلوی (شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ) کے ہاں چلے گئے ہیں، ان کی تلاش میں ایک اور صاحب بھی سرگرداں تھے، لمبا قد، چھریرا بدن، خشخشی داڑھی اور اچکن اور پاجامے میں ملبوس۔ مراکشی صاحب نے بتلایا کہ یہی مولانا عبدالعزیز میمن ہیں۔ ہم سب مل کر مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے فضیلت کدے پر پہونچے جہاں بیطار صاحب بلبل ہزار داستان بنے شیخوں کے متعلق لطائف و ظرائف بیان کر رہے تھے، اور انھوں نے ساری محفل کو کشت زعفران بنا رکھا تھا۔ ان کے ساتھ شام کے مشہور عالم استاد محمد المبارک بھی تھے، میمن صاحب کی آمد پر علمی مسائل چھڑ گئے جس میں میرے اندازے میں میمن صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ وہاں سے یونیورسٹی آتے ہوئے راستے میں پنجاب یونیورسٹی کی چھوٹی سی مسجد پڑی، جس کی پیشانی پر یہ شعر کندہ تھا

چراغ و مسجد و محراب و منبر ابوبکر و عمر عثمان و حیدر رضؓ

شیخ بہجت بیطار نے اس شعر کا مطلب دریافت کیا۔ راقم نے اس کا مطلب اردو میں جناب محمد العربی المراکشی سے بیان کیا اور انھوں نے اس کا مفہوم عربی میں شیخ صاحب کو سمجھایا۔ بیس اکیس برس گذرنے کے باوجود اس محفل کی یاد شرکاء کے دلوں میں ابھی تک

تازہ ہے۔ ۱۹۶۰ء میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ و ادارہ تحقیقات اسلامی قائم ہوئی، تو میمن صاحب اس سے متعلق ہو گئے۔ اس وقت سب سے مشکل کام کتب خانہ کی فراہمی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے عراق، شام، مصر، ترکی اور تونس وغیرہ کا سفر کیا اور ضروری کتابیں خرید لائے۔ اب ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کا کتب خانہ مطبوعات کے لحاظ سے کسی بڑے سے بڑے کتب خانے سے کم نہیں ہے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی قدردانی اور معارف پروری کی بدولت عربی زبان کے صدر شعبہ بن کر اورینٹل کالج میں تشریف لے آئے اور لاہور میں دو سال مقیم رہے، افسوس ہے کہ اس دفعہ ان سے خاطر خواہ استفادہ نہ ہو سکا۔ اب وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے درس و تدریس کے بجائے علمی و تحقیقی کاموں میں رہنمائی کے لیے زیادہ سود مند ہو سکتے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ وہ ہر اتوار کو مولانا عبیداللہ خاں ندوی کے مکتبۃ العلمیہ میں آجاتے تھے، عربی زبان و ادب سے شغف رکھنے والے اصحاب بھی ان سے ملنے وہیں چلے آتے تھے۔ راقم السطور بھی بالالتزام ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ یہ پر لطف نشست دو ڈھائی گھنٹے جاری رہتی تھی اور علمائے سلف، ان کی نادر تصانیف، نواب صدیق حسن خان کی علمی خدمات اور ہندوستانی محدثین کے کارناموں کے ذکر سے معمور رہتی تھی۔ ان کی گفتگو کا دل پسند موضوع نادر علمی کتابیں تھیں جن کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے دمشق، قاہرہ، قسطنطنیہ اور رباط کے کتب خانے چھان مارے تھے۔ قسطنطنیہ کے علمی خزائن، عجائب گھر اور سلاطین آل عثمان تک کے تاریخی آثار، وہ دلکش موضوع تھا جس پر وہ حاضرین مجلس کو گھنٹوں اپنی پر لطف گفتگو سے لطف اندوز کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے سلطان ٹیپو کی سفارت کا حال سنایا جو سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں مدد و اعانت کے لیے قسطنطنیہ بھیجی تھی۔ اس سفارت کو زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اور اس کے ارکان قسطنطنیہ

ہی میں مرکھپ گئے۔ میمن صاحب بتلاتے تھے کہ ان کا قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔ اس مجلس
میں وہ کبھی دل لگی اور تفنن و مزاح کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ عالم عرب کے بیشتر فضلاء سے ان کے
گہرے اور ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ عربوں میں وہ شامیوں کی مہمان
نوازی، نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے بڑے معترف تھے۔ اسی طرح وہ اہل تونس کی تہذیب و
شائستگی کے بڑے مداح تھے اور بتلاتے تھے کہ بیشتر تونسی ان مہاجروں کی اولاد ہیں جو اندلس کو
خیرباد کہہ کر شمالی افریقہ میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ وہ جامعہ زیتونہ کے شیخ الجامعہ طاہر بن عاشور
کی بھی تعریف کیا کرتے تھے، جو بڑھاپے میں بھی نواب صدیق حسن کی طرح خوبصورت اور دیدہ
زیب دکھائی دیتے تھے۔ شیخ طاہر بن عاشور نے قرآن مجید کی تفسیر التحریر والتنویر فی التفسیر کے نام
سے لکھی ہے اور اس میں اعجاز القرآن سے خاص طور پر اعتناء کیا ہے، وہ مصر جدید کی فرعون پرستی
سے سخت متنفر تھے۔ عرب قوم پرستی جس کا مقصد عربوں کو غیر عرب مسلمانوں سے دور رکھنا ہے
خود عربوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے۔ برخلاف اس کے وہ ترکوں کی علمی سرپرستی کے بے حد مداح
تھے جن کی علمی سرپرستی کی بدولت اسلاف کے علمی خزانے تباہ ہونے سے بچ گئے۔ اسلامی ممالک کی
دینی اور اصلاحی تحریکوں پر بھی ان کی نظر اچھی تھی۔

لاہور سے سبکدوش ہو کر وہ کراچی چلے گئے اور وہاں خاموش زندگی گذارنے لگے۔ اس کے
بعد بھی وہ ایک دو بار لاہور تشریف لائے اور ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ اس زمانے میں انھوں
نے ابوتمام کا دیوان الحماسۃ الصغری اور علی بن حمزہ بصری کی التنبیہات علی اغالیط الرواۃ شائع
کیں۔ مجلہ مجمع اللغۃ العربی (سابق مجلۃ مجمع العلمی العربی) دمشق میں انھوں نے معجم الادباء (یاقوت)
پر نقد و تبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوتا رہا۔ وہ امام رضی الدین صاغانی کی العباب الزاخر
کی اشاعت کی بڑی آرزو رکھتے تھے، چنانچہ اسی رسالہ میں انھوں نے اس کا مقدمہ بھی شائع

کیا تھا۔ کراچی میں جناب ممتاز حسن مرحوم (سابق معتمد مالیات حکومت پاکستان) اور پیر حسام الدین
راشدی ان کے بڑے مداح اور عقیدت مند تھے۔ علمی حلقوں میں ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور
باہمی طنز و تضحیک مشہور تھی۔ ممتاز حسن مرحوم کی تحریک سے انھوں نے اردو بورڈ کے زیر اہتمام عربی
لغت اور اس کی خصوصیات پر کئی خطبات دئے تھے جو اردو بورڈ کے سہ ماہی مجلے میں کئی قسطوں
میں شائع ہوئے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ پیر حسام الدین راشدی ان خطبوں کو کتابی شکل میں
شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں۔ میمن صاحب چند برس سے تنہائی اور کس مپرسی کی زندگی بسر کر
رہے تھے، تین چار برس ہوئے کہ ان کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا، اور لڑکے ملازمت کے سلسلہ
میں کہیں باہر مقیم تھے۔ صرف ایک پوتا ان کی خبرگیری کیا کرتا تھا۔ آخر عمر میں نہایت لاغر اور
کمزور ہو گئے تھے،

آخر تک حافظہ برابر اپنا کام کرتا رہا اور کتابیں ان کی مونس و ہمدم بنی رہیں۔ انھوں نے
نوے برس کی عمر میں، جو طویل تعلیمی اور علمی خدمات سے معمور تھی، ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو انتقال کیا۔

علم و فضل: مولانا عبدالعزیز میمن یادداشت میں علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ سیکڑوں عربی قصائد
اور ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔ کتب درسیہ میں دیوان المتنبی اور دیوان الحماسۃ تقریباً
مکمل حفظ تھے۔ مفضلیات، الکامل (المبرد) اور کتاب البیان والتبیین (جاحظ) کے بیشتر حصے ازبر
تھے۔ وہ عرب ممالک میں ابوالعلاء المعری پر اتھارٹی (سند) سمجھے جاتے تھے۔ نادر علمی کتابوں
کی اشاعت اور انتخاب میں ان سے مشورہ ناگزیر تھا۔ وہ مجمع اللغۃ دمشق اور قاہرہ کے بھی رکن
تھے۔ میمن صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن ذہنی جمود نام کو بھی نہ تھا۔ سیر و سیاحت اور
مختلف الخیال اصحاب فکر و نظر کی میل ملاقات نے ان کو وسیع النظر بنا دیا تھا۔ وہ امام شافعی
کے بے حد عقیدت مند اور مداح تھے اور اصول فقہ میں ان کے الرسالہ کی عربیت کی بڑی

تعریف کیا کرتے تھے۔ فقہا میں ابن حزم اور ابن عبد البر کی جامعیت اور بغدادی کی ادبیت کے بڑے قائل تھے
کہا کرتے تھے کہ جتنے علمی وادبی مآخذ ومصادر عبد القادر بغدادی (مصنف خزانۃ الادب) کی
دسترس میں تھے، وہ آج تک کسی عالم یا ادیب کو حاصل نہیں ہو سکے۔ مستشرقین میں وہ مسٹر
سالم کرینکو (Krenkow) کے جو ان کے ساتھ علی گڈھ میں کام کر چکے تھے، تبحر علمی، وسعت
معلومات اور ژرف نگاہی کے ثنا خوان تھے۔

اصلاحی خیالات: مولانا میمن درس نظامی کے نصاب تعلیم میں اصلاح وترمیم کی ضرورت شدت
سے محسوس کرتے تھے۔ نحو میں کافیہ اور شرح ملا جامی جیسی کتابوں کے بجائے الفیہ کی بعض شروح
اور ابن ہشام کی کتابیں پسند کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے لیے امام نووی کی ریاض الصالحین کی
سفارش کرتے تھے، جس میں نور نبوت کے علاوہ ادبی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ
وہ سنن ابی داود کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب الزہد والرقاق کے مطالعہ کی بھی تاکید کیا
کرتے تھے۔ تفسیر میں جلالین کے بجائے جامع البیان کی افادیت کے قائل تھے۔ ابن خلدون نے جن
کتابوں کو اصولِ فن ادب قرار دیا ہے، ان کے متعلق انھوں نے الندوہ (دور جدید) میں میری
محسن کتابوں کے عنوان کے تحت بڑا دلچسپ تبصرہ لکھا تھا۔ ان کی یہ رائے تھی کہ الکامل (المبرد)
ایک مبتدی کے لیے زیادہ مفید ہے۔ ادب الکاتب کو اقتضاب کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو
ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے۔ کتاب البیان والتبیین (جاحظ) میں فصیح نظم ونثر کے نمونے ان
چاروں سے زیادہ ہیں، اور نوادر لغت وشعر امالی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے نزدیک
حماسات میں ابو تمام کا دیوان الحماسہ سب سے عمدہ اور بہتر ہے اور نقد الشعر کے لیے ابن رشیق
کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے۔ کہا کرتے تھے کہ الغریب المصنف (ابن سلام) اور
اصلاح المنطق (ابن السکیت) وہ کتابیں ہیں، جن کا یاد ہونا ایک ادیب کے لیے نہایت ضروری

ہے۔ اول الذکر شاید ابھی تک شائع نہیں ہو سکی جب کہ موخر الذکر کتاب استاذ عبد السلام محمد
ہارون کی علمی کاوش سے بڑی آب وتاب سے شائع ہو چکی ہے۔

اس علم وفضل کے باوجود تمکنت نام کو نہ تھی، طرز معاشرت سادہ اور درویشانہ تھی، وہ سودا سلف
خود بازار سے خرید کر لاتے تھے۔ حقہ کے شوقین تھے، شاگرد تمباکو اور چلیں دور دور سے لا کر دیتے
تھے۔ طالب علموں کے استفسارات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے، لیکن زیادہ سوالوں سے
گھبراتے تھے۔ لاہور اور کراچی کے بعض احباب ان کی تنگ مزاجی اور بخل کے افسانے سناتے ہیں،
لیکن ان کی حیثیت سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں۔ انھوں نے عربی خوان طلبہ کے وظائف کے
لیے لاکھوں روپوں کے عطیات کراچی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کو دیئے۔ شاید دار العلوم ندوۃ العلما
لکھنؤ بھی ان کی فیاضی سے محروم نہ رہا۔

انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ حیدرآباد یونیورسٹی کو دے دیا۔ جب حدیث کی مشہور کتاب
مصنف عبد الرزاق شائع ہوئی تو پچاس ہزار روپے خرچ کر کے اس کے بہت سے نسخے خرید کر
عربی مدارس اور یونیورسٹیوں میں مفت تقسیم کیے۔ راقم السطور پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے
ادب سے ہٹا کر علم حدیث کی طرف متوجہ کیا، اس کی اہمیت اور افادیت واضح کی اور ہندوستانی
محدثین کی عظمت اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت
انھوں نے مجھے عربی کا ایک شعر لکھ کر دیا تھا اور میں اسی شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

ما زال یکتب فی الحدیث مجتہدا حتی وجدناک فی الحدیث مکتوبا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کی زبان کی خدمت کے صدقے میں ان کے درجات بلند کرے
اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!!

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم

از

عبدالسلام قدوائی ندوی

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کی وفات کو کم و بیش ایک مہینہ ہوچکا ہے، مگر اب تک دل انکی جدائی پر تیار نہیں ہے، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ ہر وقت نگاہ کے سامنے رہتا ہے، ان کی شفقت و محبت اور عنایت و کرم فرمائی رہ رہ کر یاد آتی ہے، اور ان کی دل آویز گفتگو کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی ہے، وہ میرے استاد بھی تھے، اور محسن و مربی بھی، تقریباً ۴۰ برس یہ روابط اس طرح قائم رہے کہ نہ میری عقیدت میں کوئی فرق آیا نہ ان کی شفقت میں کوئی کمی محسوس ہوئی، ان کے نام سے واقفیت تو ندوہ کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہوگئی تھی، رسالہ جامعہ میں ان کے مضامین بھی پڑھے تھے، اور ان کی کتاب تاریخ فلسفۂ اسلام بھی اسی زمانہ میں نظر سے گزری تھی، یہ اگرچہ طبع زاد نہیں تھی، بلکہ مشہور مستشرق دی بوئر کی کتاب کا ترجمہ تھی مگر ڈاکٹر صاحب نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ اسے اردو میں منتقل کیا تھا کہ ترجمہ کا احساس نہیں ہوتا تھا، بلکہ اصل کا گمان ہوتا ہے،

یہ شاید ان کا پہلا ترجمہ تھا، مگر اہل نظر کو اسی سے ان کی صلاحیت کا اندازہ

ہوگیا، آگے چل کر اس صلاحیت میں اور اضافہ ہوا، اور سارے ملک میں ان کی شہرت ہوگئی، گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری کے ترجمے کی مختلف لوگوں نے کوشش کی، روزنامہ ہمدرد میں بھی "میرے تجربات زندگی کے" عنوان سے مدتوں اس کے ابواب شایع ہوتے رہے مگر جب مکتبہ جامعہ نے "تلاش حق" کے نام سے عابد صاحب کا ترجمہ شایع کیا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ "میری کہانی" کے نام سے شایع ہوا تو ہر طرف سے شور تحسین بلند ہوا، اس کے بعد انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے کئے، اور پورے ملک میں ایک لایق مترجم کی حیثیت سے مشہور ہوگئے۔ وہ محض مترجم نہ تھے، بلکہ انھوں نے بہت سی کتابیں خود بھی لکھی ہیں، ان کی تحریر میں زبان کی صحت و شستگی، روانی و برجستگی، اور لطافت و حلاوت کے ساتھ زور بیان اور قوت استدلال بھی بہت ہے، وہ معلم بھی رہے ہیں، اس لئے ان کے اندر تفہیم کی غیر معمولی صلاحیت ہے، وہ اپنی بات کو دل میں اتارنے اور ذہن نشین کرنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں، زبان پر ایسی قدرت ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو عام فہم بنا دیتے ہیں، مگر عامیانہ انداز کو پاس نہیں آنے دیتے، ان کی سلاست رکاکت سے پاک ہوتی ہے، اور لطف بیان کہیں سے کلام کے وزن اور وقار کو گرنے نہیں دیتا بلکہ اس کی دل آویزی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

قنوج کے قریب داعی پور شرفا کی ایک پرانی بستی ہے، عابد صاحب وہیں کے رہنے والے تھے، اور سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اردو اور فارسی کی تعلیم کے بعد وہ انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے، اور میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی، اس زمانہ میں علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج کی مسلمانوں میں بڑی شہرت تھی، ڈاکٹر صاحب نے بھی وہاں ایم۔ اے میں داخلہ لیا لیکن زیادہ دنوں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، اور

یورپ جانے کا موقع مل گیا، پہلی جنگ عظیم کو ختم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، سیاسی اعتبار سے جرمنی تباہ ہو گیا تھا، مگر اس کی یونیورسٹیوں کا علمی اثر اب بھی باقی تھا، برلن میں ڈاکٹر ایڈورڈ اشپرانگر فلسفہ کے نامور استاد تھے، ڈاکٹر صاحب ان سے وابستہ ہو گئے، اور کئی برس تک ان کی خدمت میں رہ کر پی - ایچ ڈی کی سند حاصل کی،

ڈاکٹر صاحب عملی سیاست سے تعلق نہیں رکھتے تھے، لیکن طبیعت آزادی پسند تھی، ان کی طالب علمی کا زمانہ تحریک خلافت اور کانگریس کے شباب کا زمانہ تھا، بچہ بچہ آزادی کے نشہ میں سرشار تھا، ہندو مسلمان، پارسی سکھ سبھی آزادی کی جدوجہد میں شریک تھے، جوش و ولولہ اور قربانی و فداکاری کی عجیب فضا تھی، "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی انگریزی پالیسی سب پر آشکارا ہو چکی تھی، اور فرقہ وارانہ اتحاد کے روح پرور نظارے ہر طرف نظر آرہے تھے، اس فضا میں ڈاکٹر صاحب جیسا حساس اور آزادی پسند نوجوان کس طرح بے تعلق رہ سکتا تھا، اس وقت جو نقوش ان کے دل پر ثبت ہو گئے وہ ساری زندگی باقی رہے، جب وہ علی گڑھ آئے تو وہاں خلافت اور کانگریس کے رہنماؤں کا اثر بہت بڑھ گیا تھا، کالج کے احتیاط پسند عناصر نوجوانوں کو آزادی کی اس جدوجہد میں شرکت سے باز نہ رکھ سکے اور مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایم - اے - او کالج کے بہت سے طالب علموں، استادوں اور طلباء قدیم نے نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی علی گڑھ ہی میں بنیاد رکھدی۔

علی گڑھ میں عابد صاحب کا قیام زیادہ نہیں رہا، لیکن اس کے باوجود وہ وہاں کے ممتاز طلبہ اور اساتذہ سے واقف ہو گئے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین کو پہلی بار انھوں نے علی گڑھ ہی میں دیکھا تھا، اور ان کی ذہانت، طلاقتِ لسانی، حاضر جوابی، شرافت نفس،

خدا پرستی اور انسانیت نوازی سے بے حد متاثر ہوئے، خود ان کا بیان ہے کہ انگریزی ادب میں ایم - اے کرنے کے لئے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت سے گونج رہا تھا، دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی صفات اور دلکش شخصیت کے بارہ میں جو افسانوی روایتیں سنی تھیں وہ بڑی حد تک صحیح تھیں، مجھے ان کی ذہانت میں ایک طرف ادراک و وجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا ایک ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، آپ ان سے گفتگو کریں تو وہ چشم زدن میں بات کی تہہ تک پہونچ جاتے تھے، ان کی قوت فیصلہ بجلی کی طرح کوند کر صحیح حل کے مرکزی نقطہ کو واضح کر دیتی تھی، ان کی تقریر پہلے سیدھی دل میں اتر جاتی تھی اور پھر استدلال کے ذریعہ دماغ کو قائل کرتی تھی، ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی، بحث و مباحثہ میں انکے چبھتے ہوئے طنز و مزاح اور بے پناہ قوت مناظرہ کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہو جاتا تھا، سرسری نظر سے دیکھنے والے کو ایسا لگتا کہ وہ ایک خوش باش، لاابالی مزاج رکھتے ہیں، مگر ان کے سینہ میں ایک پُرخلوص، پُرسوز اور پُرجوش دل تھا، اور اس دل میں محکم ایمان، اٹل ارادہ اور اتھاہ ہمت و حوصلہ تھا، اپنے ذہن کو مغربی علم و عقل کی روشنی سے منور کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے دل میں نور ایمان کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔"

کچھ عرصہ کے بعد ذاکر صاحب بھی برلن پہونچ گئے، اور پروفیسر زومبارٹ کی رہنمائی میں معاشیات کی تکمیل کرنے لگے، ذاکر صاحب معاشیات کے علاوہ فلسفہ تعلیم سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں عابد صاحب کے استاذ ڈاکٹر اشپرانگر سے خاص طور سے استفادہ کرتے تھے، نیز جرمنی کے نت نئے تعلیمی تجربوں سے بھی واقفیت حاصل کرتے رہتے تھے، یہ علم و تجربہ ان کے لیے جامعہ کے چلانے میں بہت مفید ثابت ہوا،

برلن کے اس قیام میں عابد صاحب کا تعلق ان سے اور بڑھا۔ جس کی وجہ سے انھیں ان کے ساتھ جامعہ میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

اس زمانہ میں پروفیسر محمد مجیب صاحب بھی آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کی سند حاصل کرنے کے بعد پریس کے کاموں کو سیکھنے اور فن طباعت میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے برلن آگئے، اس طرح خدا نے جامعہ کے اُن خدمت گزاروں کو یکجا کر دیا، جن کی قسمت میں آیندہ تعلیم ملی کے اس سفینہ کی ناخدائی تھی، جو گرداب حوادث میں گھرا تھا، اور باد مخالف کے تیز و تند جھونکے اسے تہ و بالا کرنے پر تلے ہوئے تھے، عابد صاحب اور مجیب صاحب کو پہلے جامعہ سے کوئی خاص تعلق نہ تھا، مگر ذاکر صاحب کی ذات ایسی پرکشش تھی، اور ان کے اندر دلداری و دلنوازی کی ایسی ادائیں تھیں، جن کی بنا پر مشکل ہی سے کوئی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا تھا، پھر یہ لوگ نو دنو، علم کے ساتھ ذہن ثاقب اور عقلِ حق شناس کے ساتھ دلِ دردمند بھی رکھتے تھے، اور ان کے اندر خدمت ملی کا جذبہ اور قوم کے بخت خفتہ کو بیدار کرنے کا حوصلہ تھا، بھلا یہ ذاکر صاحب سے متاثر کیوں نہ ہوتے، انھوں نے بھی جامعہ کے خدمت گزاروں میں شامل ہونے کا عزم کر لیا۔ ذاکر صاحب نے ان کے سامنے جامعہ کی غربت و فلاکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہاں پھولوں کی سیج نہیں بلکہ صحرائے پرخار سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اس سے ان بلاکشانِ شوق کے ارادہ میں کوئی ضعف نہیں آیا، اور ہر قسم کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر ذاکر صاحب کی پرخلوص رفاقت میں ساری زندگی گزار دینے کا ارادہ کر لیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں حکیم اجمل خان جرمنی آئے، وہ ایک حاذق طبیب اور ممتاز قومی رہنما ہونے کے علاوہ جامعہ کے امیر (چانسلر) بھی تھے، ذاکر صاحب جامعہ کی

تعلق کی بنا پر اُن سے واقف تھے لیکن مجیب صاحب اور عابد صاحب کی یہ پہلی ملاقات تھی، اس وقت ہندوستان میں آزادی کی تحریک کمزور ہو گئی تھی، اور خلافت و کانگریس دونوں حلقوں میں بڑی افسردگی تھی، قوم پھر پیچھے کی طرف مڑنے لگی تھی، اور طلبہ آزاد تعلیم گاہوں کے بجائے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی جانب رخ کر رہے تھے، ان حالات میں جامعہ کا علی گڑھ میں چلنا دشوار تھا، پرجوش کارکن ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے، اساتذہ بھی اس ملی درسگاہ کو چھوڑ کر سرکاری اداروں کی طرف جا رہے تھے، اس فضا میں حکیم صاحب کو یہ نوجوان بہت غنیمت معلوم ہوئے، انھوں نے ان کے اندر جامعہ میں آنے کا شوق اور اس کے ذریعہ ملک وملت کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا، ذاکر صاحب کی کشش انگیز شخصیت نے پہلے ہی ان لوگوں کو متاثر کر رکھا تھا، حکیم صاحب کی ملاقات اور گفتگو نے اس جذبہ کو اور بڑھا دیا، عابد صاحب نے حکیم صاحب کی اس ملاقات کا اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے ذکر کیا ہے،

حکیم صاحب ہندوستان واپس آئے، تو جامعہ کا حال بیحد ابتر نظر آیا، طلبہ بے چین اساتذہ پریشان، کارکن بددل، امناء (ٹرسٹی) مستقبل سے مایوس اور رہنمایان قوم دل برداشتہ تھے، بظاہر اس ادارہ کا دم واپسیں بہت قریب محسوس ہوتا تھا، ان حالات میں گاندھی جی کی مدد سے حکیم صاحب جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی لائے اور قرول باغ میں طبیہ کالج کے قریب کرایہ کے مکانوں میں اس اجڑی ہوئی تعلیمی بستی کو پھر سے بسانے کا انتظام کیا، چند مہینوں کے بعد عابد صاحب اور مجیب صاحب ذاکر صاحب کی رفاقت میں دہلی پہنچ گئے، ان لوگوں کے آجانے سے جامعہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی پھر ابھر آئی، یہ تینوں نوعمر تھے، جامعہ کے مقاصد بہت عظیم تھے، مگر حالات بے حد ناساز گار تھے، کسی کو

مشکل سے یقین آتا تھا، کہ یہ ناتجربہ کار نو وارد اس ادارہ کو حیات نو بخشیں گے، مگر اپنے وسیع علم، مخلصانہ خدمت اور مسلسل محنت کی بدولت بہت ہی جلد یہ لوگ سب کی توجہ کا مرکز بن گئے، جامعہ کے بچے کھچے اساتذہ، طلبہ اور کارکنوں میں ایک نئی امنگ پیدا ہوئی، اور تعلیم و تربیت کا کام بڑے جوش اور ہوشمندی کے ساتھ شروع ہو گیا، ذاکر صاحب اس مختصر گروہ کے قافلہ سالار اور عابد صاحب اور مجیب صاحب ان کے میمین و یسار تھے۔

ان لوگوں کے دلوں میں جامعہ کا بہت ہی بلند تصور تھا، اور اس کے ذریعہ وہ ملک و ملت کو ایسے رخ پر لے جانا چاہتے تھے، جو امن و سکون، اعتبار و اعتماد، خلوص و محبت، اور ہمدردی و بہی خواہی کی شاہراہ تک پہونچائے، بقائے باہم کے اصول کو اس ملک میں رواج عام حاصل ہو، اور رنگ برنگ پھولوں کے گلدستہ سے قوم کی شان دوبالا ہو سکے، اس کام میں عابد صاحب اور مجیب صاحب سرگرمی کے ساتھ ذاکر صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے، ان حضرات کی بہت سی تحریریں آج بھی موجود ہیں جن سے ان کے خیالات اور جد و جہد کا پتہ چلتا ہے، عابد صاحب کی زبان میں کسی قدر لکنت تھی، اس لئے ان کو بولنے میں دقت ہوتی تھی، لیکن اس لکنت کے باوجود وہ درس بھی دیتے تھے، اور تقریر بھی کرتے تھے، مگر اس لکنت کی تلافی اللہ نے اس طرح کی تھی کہ انھیں بہت سلجھا ہوا دماغ، فکر عمیق اور قلم سیال عطا کیا تھا، ان کے قلم کی روانی نے جامعہ کی بڑی خدمت کی "مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ" کے نام سے انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی جو کہنے کو تو جامعہ کے مقاصد، طریق کار، اور نصاب و نظام تعلیم کا ایک خاکہ ہے، لیکن اس کے اندر تعلیم ملی کا جو منصوبہ پیش کیا گیا ہے، وہ ہمیشہ اس میدان میں کام کرنے والوں کی رہبری کرتا رہے گا۔

یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ جامعہ سے واقفیت ندوہ کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہو چکی تھی اپنے شفیق استاد مولانا عبدالرحمن نگرامی مرحوم کی زبانی سے بارہا اس کا ذکر سنا تھا، شیخ الہند کا خطبۂ تاسیس اور سری پی سی راے کا خطبۂ تقسیم اسناد بھی نظر سے گزر چکا تھا جامعہ کے بعض طلبہ سے ملاقات بھی ہو چکی تھی، اور کچھ ہمارے ندوہ کے فاضل بھی وہاں پہونچ چکے تھے، ان سب ذرائع سے جامعہ کے بارہ میں کافی معلومات حاصل ہو گئی تھیں، اور ذاکر صاحب کے ساتھ عابد صاحب کا نام اس طرح ذہن نشین ہو گیا تھا کہ دونوں توام بھائی معلوم ہوتے تھے، مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں ایک معمولی سی بات پر ندوہ میں بڑی اسٹرائک ہو گئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا، اس موقع پر انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جامعہ جانے کا خیال ہوا، ذاکر صاحب اس زمانہ میں شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) تھے، ان کو صورت حال لکھی اور درخواست کی کہ اگر ہمیں اپنے زیر سایہ جگہ دے سکیں تو حاضر ہوں، اس درخواست کی قبولیت کا بہت کم یقین تھا، مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب کے دل میں خدا نے کچھ ایسی ہمدردی پیدا کی کہ منظور ہو گئی، اور چند دن میں ہم جامعہ پہونچ گیے، اس سفر میں میرے عزیز دوست رئیس احمد جعفری مرحوم اور عبدالمجیب سہالوی ساتھ تھے، بعد میں محمد ابراہیم عمادی، رشید اختر، اور خلیل شرف الدین بھی ندویوں کے اس قافلہ سے آملے اور ماضی کے واقعات کو نظر انداز کر کے مستقبل کی تیاری میں لگ گئے،

اس وقت عابد صاحب اورنگ آباد میں تھے، اور ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ انگریزی اردو ڈکشنری مرتب کر رہے تھے، مجیب صاحب بھی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں وہیں مقیم تھے، شاید روسی ادب کی تاریخ لکھ رہے تھے، لیکن ہمارے داخلہ کے چند ہی

ماہ بعد تحریکِ آزادی کو پھر فروغ ہوا، اور قید و بند کا سلسلہ شروع ہو گیا، جامعہ، آزادی پسندوں کا مرکز تھا، آزادی کی اس جدوجہد کا اس پر اثر ناگزیر تھا، چنانچہ کئی ممتاز اساتذہ اور طلبہ تعلیم گاہ سے نکل کر سیاست کے میدان میں پہونچ گئے، اور وہاں سے جیل بھیج دئے گئے، حکومت کی دار و گیر سے جامعہ کو بچانے کا کام تو ذاکر صاحب اور ان کے مشیر و معاون کسی نہ کسی طرح کر رہے تھے، لیکن اساتذہ کی کمی کا کیا علاج تھا، جامعہ جیسی حکومت کی معتوب اور تہی مایہ درسگاہ میں آکر کون اپنے کو مصائب میں مبتلا کرتا، بالآخر عابد صاحب اور مجیب صاحب کو اورنگ آباد سے بلانا پڑا، ایک روز ہم لوگ ریاضی کے استاد حاجی برکت علی صاحب کے درجہ میں پڑھ رہے تھے، اچانک دو اجنبی ان سے ملنے آگئے، معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ہیں، عابد صاحب کے چہرہ پر خاصی بڑی داڑھی تھی، جو بعد کو برقرار نہیں رہی، مگر ان کے دل میں اس کی جڑیں باقی رہیں، اور زندگی کے آخری دور میں پھر چہرہ پر اسی طرح نمودار ہو گئی، یہ ان کے مذہبی جذبات کا اثر تھا، وہ زندگی کے کسی دور میں مذہب سے غافل نہیں رہے، ایمان ان کے دل و دماغ دونوں میں پیوست تھا، وہ وجدانی طور پر بھی مسلمان تھے، اور علم و استدلال کے ذریعہ بھی انھیں اسلام کی صداقت کا یقین تھا، اور اس کی اشاعت و ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے،

اس زمانہ کی انگریزی حکومت جامعہ کی مخالف تھی، اس کی سند ہندوستان میں کہیں تسلیم نہیں کی جاتی تھی، ان حالات میں طلبہ کی قلت لازمی تھی، ایسی صورت میں فلسفہ کی تعلیم کا کیسے انتظام ہوتا، عابد صاحب اس زمانہ میں کالج کے طلبہ کو اردو پڑھاتے تھے، اس کے علاوہ رسالہ جامعہ کی ادارت اور اردو اکیڈمی کی نظامت

بھی ان کے سپرد تھی، جامعہ کے طلبہ میں اردو کا جو ذوق پیدا ہوا وہ بہت کچھ عابد صاحب کا رہین منت ہے، اردو اکیڈمی کے ذریعہ انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں، اسکے اہتمام میں بڑے معرکے کے مشاعرے ہوئے، اور اعلیٰ درجہ کے مضامین پڑھے گئے، ایسی محفلیں اب کاہے کو دیکھنے کو ملیں گی، ان مشاعروں میں جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، ثاقب لکھنوی، ظریف لکھنوی، سید بریلوی، ساحل دہلوی، منور لکھنوی، برق دہلوی اکابر شعراء شریک ہوتے اور اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کرتے، یہ مشاعرے بڑے باوقار اور پرسکون ہوتے تھے، مضمون خوانی کی مجلسیں بھی بڑی شاندار ہوتی تھیں، مولانا سید سلیمان ندوی، خواجہ غلام الثقلین مولانا اسلم جیراج پوری، پروفیسر حبیب الرحمٰن، مولانا عبدالرؤف دانا پوری، خالدہ ادیب خانم، حسین رؤف بے، ڈاکٹر بہجت وہبی کس کس کو یاد کیجئے جامعہ کے ہال میں کیسے کیسے اصحابِ علم رونق افروز ہو چکے ہیں، غیر ملکی مقالہ نگاروں کے ترجمے اکثر ڈاکٹر عابد صاحب کیا کرتے تھے، خالدہ خانم کے مقالات کا مجموعہ ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ان ہی کے قلم سے کتابی شکل میں اردو میں منتقل ہوا، اور آج تک اس باب میں تاریخ کا ایک مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے، ان جلسوں کی صدارت بھی بڑے نامور اصحاب نے کی، ڈاکٹر اقبال، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر انصاری، مولانا سید سلیمان جیسے صاحبانِ علم کے خطبات صدارت نے ان مجالس کی رونق دوبالا کر دی،

کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام مکتبۂ جامعہ کرتا تھا، ان کی ظاہری آرائش و زیبائش کا اہتمام مکتبہ کے منیجر حامد علی خاں صاحب کرتے تھے، لیکن کتابوں کا معنوی وزن عابد صاحب کی توجہ کا رہین منت ہوتا تھا،

عابد صاحب بہترین مشیر تھے ان کی سوجھ بوجھ سے جامعہ کو بہت فائدہ پہنچا، غور و فکر کی صلاحیت اُن کے اندر ہمیشہ بیدار رہی، بارہا نازک حالات میں اُن کے مشورہ سے پیچیدہ مسائل حسن و خوبی کے ساتھ حل ہو گئے، مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے، ۱۹۵۱ء میں میں اُن کی طلب پر جامعہ آیا، اُس وقت وہ کالج کے پرنسپل تھے، چند سال براہ راست اُن کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملا، اس اثنا میں اور اس کے بعد بھی ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور اُن کے طریقۂ کار کو سمجھنے کا موقع ملا، اس زمانہ کے مشکلات کو آج سمجھنا دشوار ہے، تقسیم ملک سے فضا میں جو تلخی پیدا ہو گئی تھی، اس کا اثر ہنوز باقی تھا، طلبہ کی تعداد قلیل اساتذہ کم، مالی وسائل محدود اور عمارتیں برائے نام تھیں، ہندوستان کی یونیورسٹیاں عموماً جامعہ کی سندیں تسلیم نہیں کرتی تھیں، تعلیم کا دائرہ بہت تنگ تھا، چند ہی مضامین کی تعلیم کا انتظام تھا، ان سب پریشانیوں پر مستزاد یہ کہ مولینا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے تھے، ان کا قیام علی گڑھ میں رہتا تھا، اور جامعہ اُن کی باضابطہ رہنمائی سے محروم ہو گئی تھی ان حالات میں جامعہ کو برقرار رکھنا ہی مشکل تھا، چہ جائیکہ اس کو ترقی دی جائے، لیکن مجیب صاحب اور عابد صاحب نے بڑی ہمت کے ساتھ ان مشکلات کا مقابلہ کیا، ذاکر صاحب کے خالی عہدہ کو مجیب صاحب نے سنبھالا، اور اعلیٰ تعلیم کی سربراہی عابد حسین صاحب نے اپنے ذمہ لی، ان دونوں کی تندہی اور شبانہ روز کی جانفشانی نے بند راہیں کھول دیں، اور رفتہ رفتہ جامعہ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی، حکومت کی امداد میں اضافہ ہوا، جامعہ کو ایک حد تک یونیورسٹی کا درجہ ملا، نئے مضامین داخلِ نصاب ہوئے، آرٹس اور سائنس کے متعدد شعبے کھلے، متعدد عمارتیں بنیں، ملک کی یونیورسٹیوں میں اس کی سندیں تسلیم ہوئیں، اور حکومت نے اس کے مصارف کی پوری ذمہ داری اپنے سر لی،

ڈاکٹر صاحب کے بعد مجیب صاحب جب جامعہ کے سربراہ تھے انھوں نے جامعہ کی خاطر بے حد مشقت برداشت کی، مگر اس ساری جد و جہد میں عابد صاحب انکے مشیر خاص اور معین کار تھے وہ مسائل و حالات پر غور کرتے، نقشے بناتے، وسائل تلاش کرتے اور راہ کی ناہمواریوں کو ہموار کرتے اس طرح مجوزہ اسکیم کو کامیابی کی منزل تک پہونچاتے انہیں آدمیوں سے کام لینے کا بڑا سلیقہ تھا جامعہ کی ترقی کے لیے انھوں نے معلوم نہیں کیا کیا جتن کیے اور کس کس طرح مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی سطح کے اوپر سبھی کو نظر آتا ہے لیکن اس کے نیچے کا حال کم ہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے۔

جامعہ کے علاوہ ملک و ملت کی خدمت سے بھی وہ کبھی غافل نہیں ہوئے اور زبان و قلم کے ذریعہ اصلاح حال کی تدبیر کرتے رہتے تقسیم سے پہلے رسالۂ جامعہ اور اپنی تصانیف و تراجم کے ذریعہ انھوں نے باشندگانِ ملک اور ابنائے ملت کے ذہن کی تعمیر اور خیالات کی اصلاح کے لئے بڑا کام کیا اور جب ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ کشیدگی حد سے بڑھ گئی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت دشوار ہو گئی اس وقت انھوں نے "نئی روشنی" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور اس کے ذریعہ گم کردہ راہ انسانوں کی رہبری کی انھوں نے ان کے سامنے منزل کی نشاندہی کی اور وہاں تک پہنچنے کے لئے سیدھی راہ دکھائی انھوں نے جزئیات و فروعات میں الجھنے کے بجائے اصول کی طرف توجہ دلائی، اور شرافت و نیک نفسی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی، افسوس ہے کہ یہ اخبار زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا، لیکن اپنی مختصر مدتِ حیات میں بیش بہا خدمت انجام دی، معلوم نہیں اس کے مضامین کے ذریعے کتنے مایوس دلوں کو امید کی شعاع نظر آئی، کتنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو استقامت نصیب ہوئی، اور کتنے پریشان حالوں کو سکون حاصل ہوا،

۱۹۶۶ء میں انھوں نے عصر حاضر کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے اردو میں "اسلام اور عصر جدید" اور انگریزی میں "اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج" نامی دو سہ ماہی رسالے نکالے وہ چاہتے تھے، کہ مسلمان

زمانہ کے تقاضوں کو سمجھیں اور اسلام کی صحیح تعلیمات کی روشنی میں ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کریں جن میں آج سارا عالم مبتلا ہے ان کا خیال تھا کہ مسلمان خدا کے عالمگیر پیغام کے حامل ہیں ان کا فرض ہے کہ ایک طرف مغربی تہذیب کا مطالعہ کرکے اس کے امراض کا پتہ چلائیں دوسری طرف اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرکے ان امراض کی روک تھام اور علاج کی تدبیریں بتائیں

اس رسالہ کے موضوعات بحث اُن کے الفاظ میں حسب ذیل تھے۔

۱۔ عصر حاضر کی مغربی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی مطالعہ اور ان عناصر کی نشاندہی جو اسلام کی روحانی اور اخلاقی تعلیم سے ہم آہنگ ہیں اور مسلمانوں کی جائز ذہنی اور مادی ترقی میں مدد دے سکتے ہیں خصوصاً سائنس کے دائرۂ فکر کا اور سائنسی اندازِ نظر کی تشریح اور سائنس کی رفتار ترقی کا جائزہ۔

۲۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کے ان پہلوؤں پر بحث جو مسلمانوں کے، ہندوستان کے اور دنیا کے اہم ترین مسائل حاضرہ کے حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کے ان کارناموں کا ذکر جنھوں نے انسانیت کے علمی و تہذیبی سرمایہ میں اضافہ کیا،

۴۔ ان مسائل پر بحث کہ اسلام اور دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کس طرح اور کس حد تک مل کر روحانی اور اخلاقی اقدار کے مقابلہ میں تشکیک اور انکار کے اس طوفان کا مقابلہ کرسکتے ہیں جو دنیا میں اٹھتا ہوا نظر آرہا ہے،

۵۔ اسلامی معاشروں میں تجدد کی تحریکوں کا تنقیدی مطالعہ،

۶۔ اسلامی معاشروں کی علمی، تعلیمی اور تہذیبی رفتار ترقی کا جائزہ،

۷۔ اسلام سے متعلق مطبوعات پر تبصرہ،

ڈاکٹر صاحب نے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے "اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی" قائم کی تھی، یہ رسالے

اسی سوسائٹی کی طرف سے نکلتے تھے، کتابوں کا ایک سلسلہ بھی پیش نظر تھا، ان میں سے بعض تیار ہوچکی ہیں اور بعض تیار ہو رہی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی جب تک صحت رہی وہ سوسائٹی کی آمدنی بڑھانے کی کوشش کرتے رہے، اس کیلئے خط و کتابت کے علاوہ انھوں نے طویل دورے کئے، ان کوششوں سے چند ہی برس میں سوسائٹی نے بڑی ممتاز حیثیت حاصل کرلی، کئی بین الاقوامی سمینار منعقد ہوئے جن میں ہندوستان کے علاوہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کے نامور اہل قلم نے شرکت کی، اگر وہ تندرست رہتے، تو سوسائٹی کی بنیاد مستحکم ہوجاتی، لیکن اُن کی صحت جو کبھی اچھی نہ تھی، مسلسل افکار اور کثرت کار کی وجہ سے گرتی گئی پیرانہ سالی میں مدافعت کی قوت کمزور ہوگئی، تو امراض کا ہجوم ہوا، دو تین سال سے ان کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی لیکن جہاں تک ہوسکتا اپنے کو سنبھالتے اور شدید علالت کے باوجود کام کرتے رہتے، مگر ادھر تین چار ماہ سے بالکل بستر سے لگ گئے تھے، ۲۰ نومبر کو انجمن جامعہ کے جلسہ کے سلسلہ میں دہلی گیا تو ان کے یہاں بھی حاضر ہوا اس وقت غنودگی طاری تھی کچھ دیر بستر کے پاس کھڑا انھیں دیکھتا رہا، اُن کی یہ حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا، بیگم صاحبہ بھی بہت متاثر تھیں، اور صبر و ضبط کے باوجود اُن کے چہرے پر رنج و ملال کے گہرے آثار نمایاں تھے، کیوں نہ ہوتا، ۴۵-۴۶ برس کی رفاقت ختم ہورہی تھی جس کے ساتھ محبت و شیفتگی، ہمدردی و غمگساری، خلوص و وفا، اور دلداری و دلنوازی کی کتنی یادیں وابستہ تھیں، دہلی سے واپسی کے بعد خط لکھ کر برابر حالات معلوم کرتا رہا، ۱۲ دسمبر ۱۹۷۸ء کو اچانک ایک بجے دن کو ریڈیو سے ان کی وفات کا اعلان ہوا ہر چند کہ یہ خبر خلاف توقع نہ تھی مگر پھر بھی دل بیقرار اور آنکھیں اشکبار ہوگئیں، اللہ انھیں اپنی رحمت سے نوازے اور بیگم صاحبہ اور دوسرے اعزہ و احباب کو صبر کی توفیق نصیب فرمائے، اور ان کی مثال نیک کو دلیل راہ بنانے کی ہمت عطا فرمائے،

باب التقریظ والانتقاد

از عبدالسلام قدوائی ندوی

Hundred great Muslims

مصنفہ خواجہ جمیل احمد صاحب

اسلام کی تاریخ بہت طویل ہے بے شمار اقوام وملل کی داستانیں اس میں شامل ہیں، ان کا اختصار بھی ضخیم مجلدات کا طالب ہے، اگر ان تاریخ ساز اشخاص کا خیال کیا جائے جن کے روشن کارنامے اوراق روزگار کی زینت ہیں تو بھی ان کی تعداد کا شمار۔۔۔ آسان نہیں ہے، زندگی کا کون سا میدان ہے جہاں ایسے نامور افراد کا جھمگٹ نظر نہیں آتا ہے جدھر نظر اٹھتی ہے ان کی بیشمار قطاریں مصاف حیات میں سرگرم نظر آتی ہیں، ان میں صاحبان تاج و تخت بھی ہیں اور گدائے گوشہ نشین بھی، قائدین کرام بھی ہیں اور سپہ سالاران عظام بھی، علماء وحکماء بھی ہیں اور صلحاء واتقیاء بھی، خطباء بھی ہیں اور مصنفین بھی کسی گروہ کی فہرست بنانے لگئے تو کاغذوں کے انبار لگ جائیں اور پھر بھی فہرست ناتمام رہے ہماری قوت حفظ کی بہتا یہ ہے کہ کچھ ناموروں کے نام اور کام یاد رہ جائیں۔

ناواقف ہمارے اس بیان کو شاید مبالغہ سمجھیں لیکن واقفکار اس تفصیل کو اختصار قرار دینے میں بھی تامل کریں گے طبقات وتراجم اور سیر وسوانح پر جن اصحاب کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ پوری تاریخ اسلام کا کیا ذکر ہے، کسی ایک شہر کے کسی خاص صنف کے باکمال بھی ضخیم مجلدات میں سما نہیں سکتے۔ لیکن تاریخ اسلام اور نامورانِ سلف کی اس کثرت و وسعت کے باوجود

لوگوں نے اختصار وانتخاب کی کوشش کی ہے دریا کو کوزہ میں کون بند کر سکتا ہے لیکن پھر بھی یہ فقرہ زبان زد خاص وعام ہے، اس سے لوگوں کی اختصار پسندی کا اندازہ ہوتا ہے، اسی جذبہ کے تحت مختصر نویسوں نے ہر دور میں تاریخ اسلام اور رجال اسلام کے احوال وسوانح کی تلخیص کی کوشش کی ہے کسی نے اشہر مشاہیر الاسلام کے نام سے، کسی نے نامورانِ اسلام کے عنوان سے کسی نے کسی اور نام سے کتابیں مرتب کی ہیں، عرصہ ہوا پاکستان کے کسی ناشر نے انگریزی میں "فرام ابوبکر ٹو اتاترک" کے نام سے نامور مسلمانوں کی مختصر سوانح عمریوں کے ایک سلسلہ کی اشاعت کا اعلان کیا تھا، ۱۹۶۹ء میں میں نے اس سلسلہ کی کچھ کتابیں دیکھی تھیں معلوم نہیں اب یہ کتابیں مل رہی ہیں یا نایاب ہو گئی ہیں زیر تبصرہ کتاب "ہنڈرڈ گریٹ مسلمس" اسی طرز کی ایک کتاب ہے جسے خواجہ جمیل احمد نے مرتب کیا ہے اس کا آغاز سرکار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے کیا گیا ہے، اس کے بعد خلفاء راشدین کے سوانح حیات بیان کیے گئے ہیں۔ اسی باب میں حضرت ابوذر غفاریؓ، امام حسینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں،

پھر حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ اور رابعہ بصریہ کا ذکر ہے، اس کے بعد فقہاء اربعہ اور نامور مذہبی رہنماؤں کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں پھر مفکرین ومصلحین، شعراء ومصنفین، مصوروں، و فنکاروں کے احوال وسوانح درج کیے گئے ہیں۔ کتاب کے دسویں باب میں فرماں رواؤں، مدبروں اور سیاست دانوں کے اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ گیارہویں اور بارہویں باب کا تعلق فاتحین، مورخین، جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں سے ہے،

کتاب بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، واقعات کا اختصار اس طرح کیا گیا ہے، کہ اشخاص کی خصوصیت بھی سامنے آجاتی ہیں، اور اس دور کے واقعات سے بھی اجمالی طور پر آگاہی ہو جاتی ہے، مصنف کا مطالعہ بہت وسیع ہے، انھوں نے تاریخ وسیر کی طویل کتابیں پڑھ کر مختصر

کتاب مرتب کی ہے۔ لیکن انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے احتیاط اور جانچ پرتال کے باوجود کہیں کہیں کچھ غلطیاں ہو گئی ہیں۔ حضرت ابو ذر غفاری نہیں غفاری ہیں، وہ قبیلہ غفار سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے اسباب شہادت میں مروان کے متعلق بیان صحیح نہیں ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان صلح نامہ کے سلسلہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کے واقعہ تحکیم کی تصویر کشی صحیح نہیں کی گئی ہے، عام کتب تاریخ میں یہ واقعہ جس طرح بیان کیا گیا ہے، وہ نہ حقیقت کے مطابق ہے نہ صدر اول کے ان بزرگوں کے شایان شان ہے اس سلسلہ میں مورخ خضری کی تاریخ الامم الاسلامیہ کے مطالعہ سے غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔

دار المصنفین کے سلسلہ میں مولانا مسعود علی کو بھی مصنف بتایا گیا ہے حالانکہ وہ مصنف نہیں تھے بلکہ دار المصنفین کے منیجر تھے ان کی انتظامی قابلیت نے دار المصنفین کی تاسیس و تعمیر میں بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں لیکن تصنیف و تالیف سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا پاکستان جانا بالکل اتفاقی طور پر تھا، اس میں ان کے قصد و فیصلہ کا کوئی دخل نہ تھا شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے حیات سلیمان میں اس کی پوری تفصیل دے دی ہے۔

وفد خلافت جو پہلی بار سلطان عبد العزیز ابن سعود اور شریف علی کے درمیان جنگ کے زمانہ میں رفع نزاع کی غرض سے گیا تھا۔ اس کے ارکان مولانا عبد القادر قصوری، مولانا عبد الماجد بدایونی تھے، دوسرے وفد میں جو موتمر اسلامی میں شرکت کی غرض سے گیا تھا۔ اس میں سید صاحب کے ساتھ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی شامل تھے، جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس کلکتہ اور مسلم کانفرنس دہلی کے درمیان التباس ہو گیا ہے ان معمولی فروگذاشتوں سے قطع نظر کتاب مفید اور قابل قدر ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کی جائے، اور ہر تعلیم یافتہ تک پہونچائی جائے۔ ان نامورانِ اسلام کی سیرتوں اور کارناموں کے مطالعہ سے اسلام کی بڑی موثر اور دل آویز تصویر نگاہوں کے سامنے

آجائے گی، ماضی کی یہ شاندار تاریخ ہر درد مند کو ملت کی موجودہ زبوں حالی پر محزون و اشکبار کر دے گی، اس کے دل میں اصلاح حال کی تڑپ پیدا ہو گی۔ اور ماضی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ عظیم الشان مستقبل کی تعمیر کا ولولہ پیدا ہو گا۔ خلفاء راشدین اور حضرت عمرؒ بن عبد العزیز کے حالات دین و دنیا کی باہم آمیزی کا خیال دلائیں گے، اور مسلم حکومتوں کو اسلامی خلافت کے قالب میں ڈھالنے کا جذبہ بیدار ہو گا، مدرسوں اور خانقاہوں میں امام ابو حنیفہ امام مالک امام شافعی امام احمد، شیخ جیلانی، نظام الدین اولیا اور مجدد سرہندی کے نقش قدم کو دلیل راہ بنانے کا حوصلہ ہو گا، فلسفہ و حکمت کے حلقے بیرونی و خوارزمی، طوسی و ابن سینا اور زہراوی و رازی کو یاد کریں گے، اور حضرت خالد و ابو عبیدہ طارق و ابن قاسم صلاح الدین ایوبی اور محمد فاتح کے فتح و ظفر کے حیرت انگیز واقعات ہمت و جانبازی کا سبق دیں گے۔ کیا عجب ہے کہ ان عالی ہمت بزرگوں کا تذکرہ "عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا دے" ملت خفتہ بیدار ہو اور اس کے فرزند پھر اس جاں بلب دنیا کو نئی زندگی عطا کریں:

کتاب خاصی ضخیم ہے۔ کاغذ و طباعت بھی بہت خوب ہے ایسی حالت میں ۳۲ روپیہ میں چھ سو صفحات کی مجلد کتاب بہت ارزاں ہے۔ اسے فیروز اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا ہے۔ جو اصحاب اسے خریدنا چاہیں۔ وہ خواہ ناشر کو لکھیں یا مصنف سے کاشانہ، زبیدہ آئی وی اسی ۳/۵ ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸ کے پتہ پر طلب کریں۔

ہماری بادشاہی

آغاز اسلام سے موجودہ زمانہ تک کی مکمل تاریخ جس میں شروع سے اب تک کی چھوٹی بڑی سب مسلم حکومتوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں آخر میں موجودہ دنیائے اسلام کا بھی تعارف کرایا گیا ہے؛

قیمت۔ آٹھ روپے۔

"منیجر"

مطبوعاتِ جدیدہ

دوائے شافی مترجمہ مولانا ابو العلاء محمد اسمٰعیل گودھروی مرحوم، تصحیح و تعلیق مولانا سید عبد القدوس ہاشمی، بڑی تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۴۴ مجلد قیمت: دس روپیے، ناشر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، پاکستان۔

یہ علامہ ابن قیمؒ (متوفی ۷۵۱ھ) کی تصنیف الجواب الکافی لمن سال عن الدواء الشافی کا سلیس اردو ترجمہ ہے، اس میں انسان کی دینی و اخلاقی خرابیوں کے اثرات و نتائج بیان کرکے دکھایا گیا ہے کہ وہ کیسے ان خرابیوں میں مبتلا ہوتا ہے، اور ان سے بچنے اور تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، تصحیح عقائد اور اصلاح اعمال کے کیا طریقے ہیں، یہ کتاب دراصل ایک سوال کے جواب میں تحریر کی گئی تھی مصنف سے دریافت کیا گیا تھا کہ ایک شخص دنیا و آخرت کو برباد کرنے والی معصیت میں گرفتار ہے اور بڑی کوشش کے باوجود بھی اس سے چھٹکارا نہیں پاتا، ایسی صورت میں وہ کون سی تدبیر اختیار کرے" اس کے جواب میں انھوں نے پہلے متعدد حدیثوں سے یہ واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلب، روح اور جسم کی تمام بیماریوں کی دوائیں بھی پیدا کی ہیں، صدقِ دل سے دعا اور توبہ کرنے سے تمام بیماریاں اور پریشانیاں رفع ہو جاتی ہیں، اس سلسلہ میں دعا کی اہمیت اور اس کی مقبولیت و اجابت کے اسباب و آداب کے علاوہ قضا و قدر کے بعض مسائل اور رحمت خداوندی پر بھروسہ کرکے اعمال سے غفلت برتنے کے خطرناک انجام کا ذکر بھی ہے، مصنف کے نزدیک دنیا و آخرت کی تمام مصیبتوں کا سبب گناہ ہے، انھوں نے معاصی کے نقصانات تفصیل سے گنا کر بعض بڑے گناہوں شرک، قتل، اور زنا وغیرہ کی قباحت و شناعت واضح کی ہے اور ان کی شرعی سزاؤں کو عقل

حکمت کے عین مطابق ثابت کیا ہے، آخر میں مرض عشق کے دفع و ازالہ کی تدبیر اور عشق پرستی کے دنیوی و اخروی مفاسد کا ذکر ہے، حافظ ابن قیمؒ کی تصنیفات مضامین و مطالب کے علاوہ منطقیانہ ترتیب استدلال کی دلنشینی اور بیان کی حلاوت کے اعتبار سے بھی بڑی اہم ہوتی ہیں، یہ کتاب بھی اس کا نمونہ ہے، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے قرآن و حدیث اور آثار سلف کی روشنی میں لکھا ہے، اس موضوع پر متعدد مفید کتابیں موجود ہیں لیکن یہ کتاب اپنے مخصوص اسلوب، دلکش انداز بیان، اور ممتاز طریق استدلال کے لحاظ سے انوکھی ہے، اردو ترجمہ مولانا محمد اسمٰعیل گودھروی مرحوم نے عرصہ ہوا کیا تھا، اب یہ پاکستان کے مشہور اور لائق صاحب علم مولانا عبد القدوس ہاشمی کی نظر ثانی و تصحیح کے بعد چھپا ہے، انھوں نے اپنی وسعت نظر سے حوالوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور مضامین کی فہرست بھی مرتب کی ہے۔ اس ترجمہ کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے،

جدید فارسی شاعری: مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی استاد شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰ مجلد مع گردپوش قیمت عنہ ربہ انڈ پرشین سوسائٹی ۱۰۲۳/۸، شیخ چاند اسٹریٹ، لال کنواں دہلی۔

زیر نظر کتاب میں ایران کی جدید فارسی شاعری کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، شروع میں پس منظر کے طور پر قدیم فارسی شاعری کے آغاز و ارتقا کا سرسری ذکر بھی ہے۔ اس سے ایران کی موجودہ فارسی شاعری کے خصوصیات و رجحانات کے علاوہ اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کا بھی ایک حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف نے ایران کی دو اہم نئی ادبی تحریکوں "شعر نو" اور "شعر موج نو" پر خاص طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان تحریکوں سے وابستہ اہم اور قابل ذکر شعرا کے مختصر حالات بھی دیے ہیں۔ اور ان کے ردعمل کا بھی ذکر کیا ہے۔ آخر میں اس عہد کے بعض فارسی شاعروں کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ یہ کتاب مختصر ہے اردو میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے،

اس کتاب سے اس کی تلافی نہیں ہو سکی تاہم جدید فارسی شاعری کا یہ اجمالی تعارف بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے فائدہ سے خالی نہیں، مصنف کی اردو تحریر و املا میں کہیں کہیں فارسی اسلوب کا اثر نمایاں ہوگیا ہے جیسے صدائے احتجاج کو صدای احتجاج اور برطانیہ کو بریتانیا (ص ۶۹) لکھا ہے، مندرجۂ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ فارسی اسلوب کا نتیجہ ہیں جو اردو میں غلط نہیں لیکن غیر فصیح بلکہ بے محل ہیں "اور زمانے معاصر حالات سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں (ص ۴۲) معاصر ضرورتوں، تقاضوں اور تبدیلیوں سے بے بہرہ رہ گئے" (ص ۴۶) یورپ سے لوٹنے والے... لوگ معتقد ہیں کہ عام ایرانی زندگی میں حقیقی نیاپن اور ایک قسم کا بنیادی انقلاب ناگزیر ہے (ص ۴۷) محققین کا ایک گروہ معتقد ہے کہ شعری ذوق اور شاعرانہ استعداد گذشتہ ایران سے مربوط ہے (ص ۵۵) قدیم شاعری کے مدافعین اور جدید شاعری کے حامیوں کے درمیان شدید مباحث کا سبب بنتی ہے (ص ۶۵) یہی انجمن بعد میں "انجمن ادبی دانشکدہ" کے نام سے منسوب ہوئی (ص ۴۳) تہران میں واقع انتہائی خوبصورت اور مجلل ہال ہے (ص ۱۳۴ حاشیہ) یہ معاصر شعرا میں سب سے زیادہ صمیمی اور پرخلوص شاعر ہیں (ص ۱۴۶) ذریعہ کی جمع ذرائعوں (ص ۱۰) اور لفظ کی الفاظوں (ص ۲۱) لکھی ہے، مقاصد برآری کے بجائے مقاصد کی برآمدی (ص ۱) لکھا ہے۔ بعض جگہ سنین غلط درج ہیں، جیسے ۱۹۵۸ء (ص ۳) کو ۱۹۰۸ء ہونا چاہیے اور (ص ۳۱) پر ۱۹۵۶ء بھی غلط ہے۔ کتاب کی قیمت بیس روپیے بہت زیادہ ہے۔

مسعودی - مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر سید مقبول احمد، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶۴
بحیثیت جغرافیہ نگار مجلد مع گرد پوش، قیمت چھ روپیے پچیس پیسے۔ پتہ: آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دلی نمبر ۶

ابو الحسن علی بن حسین مسعودی (م ۳۴۶ھ) نامور مورخ اور ماہر جغرافیہ داں تھا، اس کتاب میں اس کی جغرافیہ نگاری کے تحریری و عملی ماخذ پر بحث کی گئی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید مقبول احمد اب ڈائرکٹر سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہیں مگر جب وہ آکسفورڈ میں زیر تعلیم اور ہملٹن گب کے مشورہ سے مسعودی کی مشہور تصنیف "مروج الذہب و معادن الجوہر" کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے تو ان کو اس کی

جغرافیہ نگاری اور سیاحی پر بھی لکھنے کا خیال ہوا۔ یہ علمی و تحقیقی کارنامہ اسی خیال کے نتیجہ میں عمل میں آیا اس پر ۱۹۴۸ء میں ان کو آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ لٹ کی ڈگری بھی ملی، یہی مقالہ ۱۹۵۳ء میں اسلامک کلچر حیدرآباد کے کئی نمبروں میں چھپا اور اب ڈاکٹر انور معظم نے اس کا اچھا اردو ترجمہ کیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں یونان و عرب کے ان فلسفیوں، مفکروں، ہیئت، فلکیات اور جغرافیہ کے ماہروں کا ذکر ہے جن کے افکار و خیالات سے مسعودی متاثر تھا اور جن کی کتابوں سے اس نے جغرافیائی تصورات و معلومات اخذ کیے تھے، دوسرے حصہ میں مسعودی کی سیاحت، شخصی روابط اور بعض سیاحوں سے ملاقات کو اس کی جغرافیہ نگاری کا ماخذ بتایا گیا ہے۔ ہر حصہ میں مسعودی کے مخصوص جغرافیائی خیالات و تصورات کا بھی ذکر ہے، اس نے قدیم اور اپنے عہد کے ہندوستانی راجاؤں کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کا خلاصہ تحریر کر دیا ہے۔ آخر میں علی گڈھ یونیورسٹی کے کتب خانہ کے مسعودی کی جانب منسوب ایک مخطوطہ "عجائب الدنیا" کے محتویات کا جائزہ لے کر تحقیق و دلائل سے ثابت کیا ہے کہ وہ مسعودی کی تصنیف نہیں ہے، شروع میں اس کے حالات و واقعات زندگی اور کمالات کا مختصر مرقع بھی پیش کیا ہے یہ کتاب حشو و زوائد سے خالی اور مصنف کے فکر و مطالعہ کا اچھا نمونہ ہے۔

براتِ معنی: از جناب رئیس نعمانی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰
قیمت ۳ روپیے (۱) علمستان ۱۹۱/۱ اصطبل چارباغ، لکھنؤ (۲) دانش محل، امین الدولہ
پارک امین آباد لکھنؤ۔ ہند۔

جناب رئیس نعمانی کو فارسی زبان و ادب سے عشق ہے۔ وہ اس زبان میں کئی کتابیں مرتب کر چکے ہیں جن میں سے چند چھپ گئی ہیں "براتِ معنی" ان کا نیا مجموعہ کلام ہے، وہ ابھی نوجوان ہیں مگر ان کے کلام میں پختگی اور غزلوں میں مستی و سرشاری کی کیفیت اور تغزل کی شوخی موجود

ہے، غزلوں میں حکیمانہ اور اخلاقی مضامین اور اس عہد کے ابتر حالات کا بھی ذکر ہے، اس مجموعہ میں مخمسات قطعات اور بعض دوسرے اصناف کلام بھی درج ہیں، حضرت امام حسینؓ کی مدح ومنقبت میں ایک نظم خوب ہے، اس زمانہ میں اردو پر جب سخت وقت آیا ہے ایسے ناسا عد اور حوصلہ شکن حالات میں فارسی زبان وادب کی خدمت وترقی کے بجائے ہمارے یہ نوجوان شاعر اپنی صلاحیتیں اردو کی خدمت میں صرف کریں تو زیادہ مفید ہو، خصوصاً جب سبک ایرانی کے مغرور حامی سبک ہندی کو کسی زمانہ میں بھی لائق توجہ نہیں سمجھے ہیں :-

ذوق نظر: از جناب سید نظر برنی صاحب تقطیع خورد کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۴۴ مجلد قیمت عنہ ر پتہ :- ادبی سنگم، جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵

یہ جناب نظر برنی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے، غزلوں میں قدیم انداز سخن اور طرز تغزل کی روایتوں اور خصوصیتوں کے ساتھ روانی وبرجستگی پائی جاتی ہے، نظموں میں اس دور کے واقعات وحقائق پر تبصرہ اور قوم ووطن کے مسائل کا ذکر ہے، بعض نعتیں بھی ہیں اور بعض نظموں میں بزرگان دین کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں کچھ بے احتیاطی ہو گئی ہے اور حدود ومراتب کے نازک فرق کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ ۲۰۱ پر مال کو مونث لکھا ہے۔

ایک بالہ:- از جناب قاضی فضل محمد صدیقی تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۵ پیسے پتہ: قاضی بک سیلر، پہاسو، ضلع بلند شہر،

اس ناول میں ایک شخص کے عشق ومحبت کی فرضی داستان بیان کی گئی ہے اس سے موجودہ تہذیب ومعاشرت کے بعض رخ سامنے آتے ہیں قصہ دلچسپ اور پیرایۂ بیان موثر ہے لیکن بعض کرداروں میں جھول کے علاوہ کہیں کہیں زبان میں بڑی خامیاں اور بکثرت جملے غلط ہیں۔

"ض"

جلد ۱۲۳ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۹ء عدد ۲

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد